تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

جلد04 | شمارہ 04 | ماہ اپریل 2019ء

سرپرست
محمد رحیم الدین انصاری
صدر نشین تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

ایڈیٹر
محمد عبدالوحید
ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ قومی زبان، صدر دفتر تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی، چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی، حیدرآباد 001 500 تلنگانہ اسٹیٹ۔ انڈیا

Printed by Md. Abdul Waheed and Published by Md. Abdul Waheed
on behalf of Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept.,Govt.of Telangana,
Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging ,
11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul,500 0 04 Hyderabad, T.S.
Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931**Email:** qaumizaban.tsua2015@gmail.com

ماہنامہ

قومی زبان

مدیر	:	محمد عبدالوحید، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ناشر وطابع	:	محمد عبدالوحید، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ترتیب وتزئین	:	محمد ارشد مبین زبیری
سرورق	:	سید مجیب الدین
طباعت	:	طٰہٰ انٹر پرائزیس، ریڈ ہلز، لکڑی کا پل، حیدرآباد
ماہ	:	اپریل 2019ء
جلد	:	چہارم
شمارہ	:	(04)
استحقاق	:	تمام حقوق تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کی تحویل میں ہیں
مبادلہ ماہانہ	:	15-00 (پندرہ) روپے
مبادلہ سالانہ	:	150-00 (ایک سو پچاس) روپے

قومی زبان ''میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

قرینہ

ہم کلامی	:	محمد عبدالوحید	6
گوشۂ علامہ اقبالؔ:			
''مکاتیب ڈاکٹر علامہ اقبال''	:	مجید صدیقی	7
اورنگ آباد اور اقبال	:	ڈاکٹر رؤف خیر	12
شاعر مشرق علامہ اقبال کی فکر و نظر کا نچوڑ	:	ڈاکٹر مسعود جعفری	17
اقبالؔ کی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی شعری کائنات کی عصری معنویت:		ڈاکٹر بلال احمد میر	20
مضامین :			
غالبؔ کی شاعری: حسی تجربوں کا تخلیقی ارتکاز	:	ڈاکٹر قطب سرشار	30
تحریک آزادی میں اُردو شعراء کا کردار	:	ڈاکٹر ضامن علی حسرت	35
جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں تصوّف کی روشنی	:	ڈاکٹر معین افروزؔ	41
فیض احمد فیضؔ کی حبسیہ شاعری	:	عابد حسین گنائی	45
موضوع کا جادوگر (احمد فراز)	:	سجاد احمد صوفی	50
مولانا شبلیؔ بحیثیت سوانح نگار	:	بلال احمد ڈار	57
پروفیسر یوسف سرمست کی تنقید نگاری کا مجموعی جائزہ	:	نظیر احمد گنائی	64
گوشۂ خواتین :			
ادبی صحافت کے فروغ میں حیدرآبادی خواتین کا حصہ	:	ڈاکٹر رفیعہ نسیم	68
گوشہ اطفال :			
ادب اطفال، اہمیت اور تقاضے	:	ڈاکٹر بانو سرتاج	72
حصہ نظم :			
غزلیں	:	رحمنؔ جامی	79
غزلیں	:	جمیلؔ نظام آبادی	80
غزلیں	:	محمد محبوب خان افسرؔ عثمانی	81
غزلیں	:	مختارؔ ٹونکی	82

oOo

ہم کلامی

ماہ اپریل 2019ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ ماہ اپریل شاعر مشرق علامہ اقبال کی وفات کا مہینہ ہے' اس مناسبت سے اس ماہ کے شمارے میں ''گوشہ علامہ اقبال'' کے تحت ممتاز ادیبوں وقلم کاروں کے مضامین شائع کئے گئے ہیں' امید ہے کہ ان مضامین سے علامہ اقبال کے فن اور کارناموں کے تعلق سے قارئین کو کارآمد معلومات حاصل ہوں گی۔ اسی طرح اس شمارے میں حسب معمول ممتاز ادیبوں واسکالرس کے تحقیقی ومعلوماتی مضامین شائع کئے گئے ہیں جب کہ گوشہ خواتین اور گوشہ اطفال میں ماہرین کے مضامین شامل ہیں' اس کے علاوہ معروف شعرائے کرام کے کلام سے اس رسالے کو زینت بخشی گئی ہے۔

تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی فروغ اُردو کے سلسلہ میں جاری سالانہ اسکیمات کی عمل آوری میں مصروف ہے' جن میں ریاست تلنگان میں گرمائی تعطیلات کے موقع پر مدارس' انجمنوں اور اداروں کے ذریعہ ''گرمائی اُردو کلاسس'' کا اہتمام' اُردو لائبریریز کو ادبی' فنی' سائنسی' معاشرتی' معلوماتی اور شعرائے کرام کے کلام سے مزین کتابوں کی فراہمی' اُردو مصنفین کی کتابوں کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت' مطبوعات پر انعامات وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا ایک اہم کام بچوں کا اُردو رسالہ ''روشن ستارے'' کا اجراء ہے جس کی کارروائی جاری ہے اور امید ہے کہ بہت جلد یہ رسالہ منظرِ عام پر ہوگا۔ اس رسالے کی ملٹی کلر میں خوبصورت اور دلفریب طباعت کرائی جارہی ہے۔ اُردو اکیڈیمی کی کوشش ہے کہ اس کے ادبی ماہنامہ ترجمان قومی زبان کی بھی ملٹی کلر کے ساتھ تزئین نو کی جائے۔ اس سلسلہ میں بھی کام جاری ہے۔

تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کے صدر نشین جناب محمد رحیم الدین انصاری صاحب کی سرپرستی میں ہماری کوشش رہے گی کہ اُردو زبان وادب کے فروغ کے لئے مزید نئی اسکیمات کو متعارف کرایا جائے اور اُردو مدارس کو کارکرد بنانے' طلباء کے کلاس روم کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس کوشش میں آپ تمام محبانِ اُردو کا ساتھ ضروری ہے' آپ کی قیمتی آراء کی قدر کی جائے گی۔

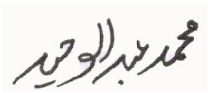

محمد عبدالوحید
ایڈیٹر

مجید صدیقی
حیدرآباد

''مکاتیب ڈاکٹر علامہ اقبال''

ڈاکٹر علامہ اقبال مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی خاص تعلق رکھتے تھے ۔ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد کی جیل سے رہائی ہوئی ہے معلوم ہوا' سن کر اطمینان ہوا۔

شاعرمشرق ڈاکٹر علامہ اقبال اپنے قریبی دوستوں اورملت اسلامیہ کے خدمت گزاروں، ماہرین تعلیم' ڈاکٹرز پروفیسرز اورمختلف ادباء کو بڑے بے تکلفانہ انداز سے اوراپنے تعلقات کالحاظ کرتے ہوئے خطوط لکھے ہیں جس سے ڈاکٹر اقبال کے نزدیک اُن حضرات کی علمی خدمات کی اہمیت اوران کے بارے میں ڈاکٹر اقبال کے نظریات کا پتہ چلتا ہے۔

خطوط اورسادگی کی منہ بولتی تصویریں ہیں اورکسی بھی خط سے یہ ظاہرنہیں ہوتا کہ عالمی سطح کا ایک مفکرکسی اپنے نامعلوم دوست یا شناسا سے مخاطب ہے۔سادگی اورخلوص علامہ اقبال کے مزاج کا مرکزی وصف رہا ہے اوروہ اپنے آپ کو کمطریق اورعاجز کہلانے پر بہت خوش ہوا کرتے تھے ۔غروراورگھمنڈ اُنہیں چھوکر بھی گیا تھا ۔علامہ اقبال کا خطوط کے توسط سے حیدرآباد سے بھی تعلق رہا ہے۔

آپ نے پروفیسر محمد صلاح الدین الیاس برنی صاحب ناظم دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے نام کئی دوستانہ خطوط لکھے ہیں اوربعض خطوط میں اپنے مزاج کی کیفیت اوردواؤں کی ترسیل کی گزارش بھی کی ہے جو ۸/مارچ ۱۹۱۷ء سے لے کر ۲۷/مئی ۱۹۳۷ء تک ہیں جو ''جاوید منزل لاہور سے لکھے گئے تھے۔دیگر چند خطوط ڈاکٹر اقبال نے محترمہ ''صفرا بیگم ہمایوں مرزا'' کے نام لکھے ہیں جوایک قابل ادیبہ تھیں اوران کا مکان اورادارہ ''مسجد عزیزیہ ''ہمایوں نگر' مہدی پٹنم کے روبروواقع ہے ۔جس کا سلسلہ ۲۸/نومبر ۱۹۲۲ء سے شروع ہوکر لاہور ۱۲/جولائی ۱۹۲۸ء تک کل چار خطوط پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر اقبالؔ نے حیدرآباد کی ایک علمی وادبی شخصیت ''جناب سید نصیرالدین ہاشمی کے نام بھی (3) خطوط لکھے ہیں جن کا سلسلہ ۷/مئی ۱۹۲۵ء سے شروع ہوکر ۸/ڈسمبر ۱۹۳۶ء تک قائم رہا۔

نصیرالدین ہاشمی نے اپنی مرثیہ کتاب ''دکن میں اُردو'' کا پہلے ایک نسخہ پھر بعد میں دوسرا حصہ ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں روانہ کیا تھا جس پر ڈاکٹر صاحب نے بہت بہت نہ صرف مبارک باد دی بلکہ مزید

کچھ کتابوں کی تحریر کرنے کے لئے رہنمائی بھی فرمائی تھی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر اقبال نے ''کشمیری قائد'' شیخ محمد عبداللہ'' ڈاکٹر سر راس مسعود کو تو بے شمار خطوط لکھے ہیں۔ (فرزند جناب سرسید احمد خان بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) جن سے ان کے قریبی مراسم ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

یہاں اس موقع پر ہم جناب نصیرالدین ہاشمی' محترمہ صفراء بیگم ہمایوں مرزا اور پروفیسر صلاح الدین الیاس برنی صاحب ناظم دارالترجمہ کو لکھے گئے چند خطوط کو نقل کرتے ہیں 'جو ڈاکٹر صاحب کی حیدرآباد سے قلبی وابستگی کا ثبوت ہے۔

''سید نصیرالدین ہاشمی کے نام''

لاہور۔ ۷/مئی ۱۹۲۵ء

جناب من السلام علیکم

''میں تقرس کی وجہ سے صاحب فراش تھا'' اس واسطے اس سے پہلے آپ کے خط کا جواب نہ لکھ سکا' معاف فرمایئے۔

''دکن میں اردو'' نہایت مفید کتاب ہے' خصوصاً اس کا پہلا حصہ جو میں نے غور سے پڑھا ہے۔ اردو زبان اور لٹریچر کی تاریخ کے لئے جس قدر مسالہ ممکن ہو جمع کرنا ضروری ہے' غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالہ موجود ہے۔ اگر اس کو جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہوگئی تو مورخ اردو کے لئے نئے سوالات پیدا ہونگے۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ مخلص۔ محمد اقبال

نوٹ:۔ اس خط کے کئی سال بعد مولانا محمود شیرانی نے' ''پنجاب میں اُردو'' نام سے کتاب شائع فرمائی۔

ڈاکٹر اقبال کا دوسرا خط:۔

لاہور۔ ۹/مئی ۱۹۳۲ء

مخدوم من

''یوروپ میں دکھنی مخطوطات کا نسخہ جو آپ نے بکمال عنایت مجھے مرحمت فرمایا ہے اس کے لئے شکر گزار ہوں۔ یہ کتاب اردو زبان اور لٹریچر کی تاریخ میں نہایت مفید ثابت ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسی مفید تالیف کا سلسلہ جاری رکھ سکنے میں کامیاب ہوں گے۔ ابھی بہت سے مواد کا جمع ہونا اور بہت سی کتابوں کے صحیح ایڈیشنوں کا چھپنا باقی ہے تاکہ اُردو کے ارتقاء کی ایک صحیح تاریخ مدون ہو سکے۔ آپ کا یہ کارنامہ قابل قدر ہے اور میں آپ کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں۔

مخلص

محمد اقبال

ڈاکٹر اقبال کا تیسرا خط:۔

جناب من

کتاب ''دکن میں اُردو'' جو آپ کے بکمال عنایت ارسال فرمائی ہے' آج ہی موصول ہوئی۔ شکریہ قبول فرمایئے۔ میں ایک مدت سے علیل ہوں' فی الحال اسے پڑھنے اور اس سے مستفید ہونے سے قاصر ہوں۔

محمد اقبال لاہور۔

۸/ڈسمبر ۱۹۳۶ء

ڈاکٹر علامہ اقبال نے محترمہ صفراء ہمایوں مرزا کے نام (4) خطوط لکھے ہیں اور بعض تو محترمہ

صفراء صاحبہ کے خطوط کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کیہ یہ وہی صفراء بیگم ہمایو ں مرزا ہونگی جو ایک مشہور ادیبہ اور انجمن اُردو خواتین کی بانی رہ چکی ہیں جن کا مکان' مسجد عزیزیہ، ہمایوں نگر کے روبرو واقع ہے جس میں آج کل لڑکیوں کے لیئے ''صفدریہ '' ہائی اسکول بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔ محلّہ ہمایوں نگر بھی جناب ہمایوں مرزا کی مناسبت سے رکھا گیا ہے جو مہدی پٹنم کا علاقہ ہے۔ صفراء بیگم ہمایوں مرزا کے بارے میں خواتین وحضرات محققین ان کی ادبی سرگرمیو ں اور اُردو زبان میں ان کی خدمات کے بارے میں روشنی ڈالیں تو مہربانی ہوگی۔

لاہور

۲۸/نومبر ۱۹۲۲ء

مکرمہ۔ تسلیم

رسالہ النساء کے لئے نہایت سپاس گزار ہوں۔ بہت اچھا رسالہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا مطالعہ مسلمان عورتوں کے لئے بہت سبق آموز ہوگا۔

(خط جاری)

میں کچھ مدت سے اردو میں بہت کم لکھتا ہوں' لیکن اگر کچھ اردو اشعار ہو گئے تو بھیج دوں گا۔

محمد اقبال

دوسرا خط محترمہ صفرا ہمایوں بیگم صاحبہ کے نام

مخدومہ جناب صفرا ہمایوں بیگم صاحبہ

تسلیم۔ آپ کے والا نامہ ابھی ملا ہے' جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ میری صحت ایک مدت سے خراب ہے' اسی واسطے لٹریری مشاغل طرف بہت کم توجہ کرسکتا ہوں۔ پیام مشرق' نام ایک مجموعہ نظم جو فارسی میں ہے تیار ہو رہا ہے۔ شاید دو تین ماہ میں تیار ہو جائے گا۔ انشاء اللہ ایک کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ لیکن چونکہ اندیشہ ہے کہ بھول نہ جاؤں' اس واسطے اگر کتاب آپ کو نہ پہنچے تو بلا تکلف یاد دلا دیجئے۔

آپ کے شوہر ہمایوں مرزا صاحب سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہے' لیکن میں نے آپ کا خط جو ہزار داستاں میں شائع ہوا ہے پڑھا ہے۔

اس خط کے پڑھنے سے مجھے خاص مسرت ہوئی۔ فریاد مرحوم کی لٹریری عظمت میں کس کو کلام ہوسکتا ہے جن کے شاگردوں میں شاد عظیم آبادی ہوں۔

اُمید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

محمد اقبال' لاہور

۲۸/فبروری ۱۹۲۳ء

میرا خط محترمہ صفراء بیگم ہمایوں مرزا کے نام۔

لاہور ۴/اکتوبر ۱۹۲۳ء

مکرمہ تسلیم

افسوس کہ میں وعدہ یاد نہ رکھ سکا' جس سے مجھے ندامت ہے' امید کہ آپ معاف فرمائیں گی۔

بہرحال کل پبلیشر کو لکھ بھیجوں گا کہ وہ پیام مشرق کی ایک جلد آپ کی خدمت میں بھیج دے۔ مضمون

لکھنے کی فرصت نہ ملی اور نہ ابھی کچھ مدت تک ایسی فرصت ملے گی توقع ہے' کیونکہ فرصت کے اوقات میں مجھے بعض ضروری لٹریری کاموں کی تکمیل کرنا ہے۔

محمد اقبال

ڈاکٹر علامہ اقبال کا چوتھا خط محترمہ صفراء بیگم ہمایوں مرزا کے نام:

لاہور۔ ۱۲/جولائی ۱۹۲۸ء

جناب محترمہ تسلیم

آپ کے اشعار صاف ہیں۔افسوس کہ میں فن اصلاح سے نابلد ہوں۔محض آپ کے تعمیل ارشاد کے خیال سے بعض جگہ کچھ الفاظ بدل دیئے گئے۔رسالہ نور جہاں امرتسر میں بھیج دیجئے۔میری بیوی سلام عرض کرتی ہیں۔مخلص

محمد اقبال

ڈاکٹر علامہ اقبال نے اپنے قریبی دوستوں جیسے فرزند سرسید احمد خان' جناب ڈاکٹر سر راس مسعود اور لیڈی مسعود اور دیگر دانشوروں جیسے نواب سید۔۔۔خان شیروانی کو متعدد خطوط لکھے جن میں اکثر اپنی دیرینہ بیماری کا تذکرہ 'اور خط کے آخر میں علی بخش کا سلام جو شاید اقبال کے یہاں ملازم تھے اور کبھی کبھی لکھتے میری محترمہ آپ کو سلام کہتی ہیں اور بعض جگہ رقمطراز ہیں کہ ''جاوید ابھی ابھی اسکول سے آیا ہے (فرزند اقبال) وہ اور بیٹی منیرہ بھی سلام کہتے ہیں۔

بعض خطوط میں اقبال مولانا سید سلیمان ندوی کی صحت کے بارے میں فکر و تردد کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی صحت کے لئے دعا گو رہتے ہیں۔مولانا ندوی کو اقبال انتہا استاد مانتے تھے۔

ایک جگہ سر سید راس مسعود کے نام زیادہ تر اپنے نجی معاملات میں بتاتے ہیں کہ ''میں نے اپنے گھر کے انتظام کے لئے ایک جرمن خاتون کی خدمات حاصل کی ہیں تاکہ جاوید اور منیرہ (فرزند و دختر) ڈاکٹر اقبال کی نگہداشت اور گھر کے عام انتظام کے لئے۔یہ محترمہ اسلامی معاشرت سے واقف اور اُردو بول سکتی ہیں۔انہیں پروفیسر رشید صدیقی اور دیگر احباب نے شرافت کی بہت تعریف کی ہے۔اگر وہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کامیاب ہوگئی تو مجھے بے فکری ہو جائیگی۔جاوید کی عمر اس وقت تیرہ سال اور منیرہ کی تقریباً سات سال ہے۔

ماں کی موت سے ان کی تربیت میں بہت نقص رہ گئے ہیں۔یہ جرمن لیڈی ایک پروفیسر کی بیوی کی بہن ہے جو علی گڑھ میں رہا کرتی تھیں۔کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ''ہاں تم سن کر تعجب کرو گے کہ سر اکبر حیدری کا خط مجھ کو لندن سے آیا ہے' اور بہت دل خوش کن۔ والسلام

محمد اقبال

فلسطین نہ تو یہودیوں اور نہ عیسائیوں کا مقام رہا ہے۔مسئلہ فسلطین ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے اور برطانیہ کو دراصل اپنے امیر ملزم کے لئے ایک مقام کی تلاش ہے۔یہودی ابھی بھی فلسطین میں ہے کہ متمنی نہیں ہے لیکن انہیں دنیا کے کونے کونے سے چن چن کر وہاں لاکر بسایا گیا ہے۔ محمد اقبال۔

ڈاکٹر علامہ اقبال نے پروفیسر صلاح الدین

محمد الیاس برنی کے نام (9) خطوط لکھے تھے جس میں انہوں نے اپنے مزاج کی کیفیت ان سے دواؤں کا حصول اور پروفیسر صاحب جو ناظم دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد تھے ان کتابوں کے حصول کے بعد بہت تعریف بھی کی ہے اور شکریہ بھی ادا کیا ہے۔

اپنے دوستوں کو لکھے گئے خطوط میں ڈاکٹر اقبال نے دہلی کے ایک حکیم نابینا صاحب کا بھی ذکر کیا ہے جن کے وہ زیر علاج رہے اور اُس سے کچھ آواز میں بہتری اور دمّہ بھی کم ہے کا اعتراف کیا ہے۔

۸/ مارچ ۱۹۱۷ء لاہور

پروفیسر صلاح الدین محمد الیاس برنی کے نام۔

کتاب المقیت مل گئی تھی، مگر میں دردِ گردے کے دورے کی وجہ سے صاحب فرائش تھا اور اب تک پورے طور پر صحت نہیں ہوئی ہے۔ گو پہلے کی بہ نسبت بہت افاقہ ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ آپ کی عنایت کا شکریہ ادا نہ کرسکا۔ آپ کی تصنیف اردو زبان پر ایک احسان عظیم ہے۔ مجھے یہ کہنے پر ذرا بھی تامل نہیں کہ اردو زبان میں علم الاقتصاد پر یہ پہلی کتاب ہے اور ہر پہلو سے کامل۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال، لاہور

شیخ محمد عبداللہ کشمیری کے نام

لاہور۔ ۱۲/ اکتوبر ۱۹۳۳ء

ڈیر شیخ عبداللہ صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ مسلم کانفرنس کشمیر کے اخبار پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ بزبان کشمیر بہت جلد اپنے معاملات سلجھا سکیں گے۔

اِس بات کے لئے میں ہرلحظہ دست بہ دعا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے آپ کی مساعی کو بارآور کرے گا۔ لیکن جو مختلف جماعتیں سنا ہے کریں گئی ہیں اور ان کا باہمی اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل بہت بڑی رکاوٹ ہوگا۔ ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی وتمدنی مشکلات کا علاج ہے۔ ہندی مسلمانوں کے کام اب تک بعض اس وجہ سے بگڑے رہے کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہوسکی اور اس کے افراد اور بالخصوص علماء اوروں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے رہے۔ بلکہ اس وقت میں۔ بہرحال دعا ہے کہ آپ کے ملک کو یہ تحریر نہ ہو۔ افسوس ہے کہ میں اور مشاغل کی وجہ سے کانفرنس میں شریک نہ ہوسکوں گا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

محمد اقبال

☆☆☆

مضمون نگاران سے التماس

مضامین اور شعری کلام روانہ کرنے والوں سے التماس ہے کہ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا نام، بنک پاس بک کی کاپی اور مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر و فون نمبر روانہ کریں۔ ان شرائط کی تکمیل پر ہی آپ کی نگارشات قابل اشاعت ہونگی۔

ادارہ قومی زبان

ڈاکٹر رؤف خیر
حیدرآباد

اورنگ آباد اور اقبالؔ

علامہ اقبال کو مسلم ریاستوں اور مسلم فرمارواؤں سے یک گونہ محبت رہی ہے۔ بھوپال میں ان کی آمد و قیام اس بات کا ثبوت ہے۔ نادرشاہ والی افغانستان کی دعوت پر وہاں اک بہتر یونیورسٹی کے لئے بہتر نصاب کی تیاری کے لئے سفر بھی اسی جذبہ خیر کا غماز ہے۔ اسی طرح وہ حیدرآباد کی مسلم ریاست بطور ہائی کورٹ جج خدمات انجام دینا چاہتے تھے مگر افسوس کہ اقبال کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

۱۹۰۳ء میں اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے فلسفے کی تعلیم دینے پر مامور تھے۔ (مدیر مخزن) شیخ عبدالقادر جب ۱۹۰۴ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے یوروپ گئے تو اقبال کے دل میں ولایت جاکر پڑھنے کا خیال جاگا۔ ان کے بڑے بھائی عطا محمد برٹش فوج میں اوورسیئر تھے، چنانچہ انہوں نے اقبال کی آرزو پوری کی اور اقبال کو ۱۹۰۵ء میں پانی کے جہاز سے یورپ بھیجا اور گورنمنٹ کالج لاہور سے اقبال نے تین سال کے لئے رخصت بلاتنخواہ Leave on loss of pay لے لی۔ (واپس آکر انہوں نے ملازمت جاری رکھی) حالانکہ اقبال کے بھائی عطا محمد کسی فوجداری مقدمے میں ملوث ہوکر معطل کر دیئے گئے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اقبال کے یوروپ جانے کی راہ ہموار کی۔ یہی سبب ہے کہ یوروپ جانے سے پہلے اقبال نے ان کا خیال رکھنے کے لئے حضرت نظام الدین اولیاء کو سونپتے ہوئے اک نظم التجائے مسافر لکھی جو دہلی میں درگاہ میں آج تک آویزاں بھی ہے اور جو بانگ درا میں بھی موجود ہے۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری ،فیض عام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
وہ میرا یوسفِ ثانی وہ شمع محفل عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جاں مجھ کو
ریاض دہر میں مانند گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز ترا زجاں وجاں مجھ کو
شگفتہ ہوکے کلی دل کی پھول ہوجائے
یہ التجائے مسافر قبول ہوجائے

اقبال ۱۹۰۸ء میں پی ایچ۔ ڈی اور بیرسٹر ہوکر ہندوستان لوٹ آئے اور اپنی ملازمت پر رجوع ہوگئے۔ اس

عرصے میں اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ ان کے معطل شدہ بھائی بھی بحال ہوگئے مگر دیوالالی چھاؤنی ضلع ناسک (اب مہاراشٹر میں)فوج میں ایس ڈی او(ورکس)غالباً سب ڈویزنل اوورسیئر کی حیثیت سے ان کا تبادلہ کردیا گیا تھا۔علامہ اقبال ۱۸/مارچ ۱۹۱۰ء کو لاہور سے حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئے۔دودن کے مسلسل سفر کے بعد وہ ۲۰/مارچ کو حیدرآباد پہنچے۔مہاراجہ کشن پرشاد سے اقبال کی خط کتابت تھی، چنانچہ مہاراجہ سے اقبال کی ملاقات ہوئی۔اسی سفر میں انہوں نے ''گورستان شاہی'' کی زیارت پر معرکہ آرا نظم بھی کہی تھی۔مگر اقبال کو حیدرآباد کے حضور نظام سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔یہ بھی واضح نہیں ہوتا کیا ہائی کورٹ کی ججی کے امیدوار کی حیثیت سے اقبال تشریف لائے تھے؟ یہاں ملکی وغیرملکی بکھیڑوں کا حال دیکھ کر کیا دست برداری اختیار کرلی ؟اقبال ۔تشکیلی دور(۱۹۱۳ء ۔۱۹۰۵ء)کے مصنف خرم علی شفیق کی تحقیق کے مطابق اقبال نے اپنی بیاض میں لاہور سے حیدرآباد پھر حیدرآباد سے براہ منماڑ واپسی کے اوقات کا جدول بنا رکھا تھا جس میں ریل گاڑیوں کے کے نظام الاوقات کے گھنٹوں منٹوں کی تفصیلات درج ہیں۔ اقبال کی یہ بیاض اقبال میوزیم جاوید منزل لاہور کی فہرست کے مطابق شمارنمبر ۲۱۹۔۱۹۷۷۔AIM پر موجود ہے۔ براہ منماڑ لاہور واپس ہونے کے ارادے ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال اورنگ آباد میں اورنگ زیب عالم گیر کے مزار پر حاضری دینے کے مشتاق تھے،اس کے علاوہ وہ اپنے محسن بھائی عطا محمد سے بھی ملنا چاہتے تھے جو دیوالی چھاؤنی میں ایس ڈی او کی حیثیت خدمت انجام دے رہے تھے۔ ٹیپوسلطان اورحضرت اورنگ زیب عالم گیر سے اقبال کو بے پناہ عقیدت تھی۔اس عقیدت کے پیش نظر اقبال کا اورنگ آباد کا سفر قرین قیاس لگتا ہے جس کا مدلل ثبوت جناب عنایت علی نے اپنی تحقیقی کتاب ''اقبال اوراورنگ آباد'' (مطبوعہ جولائی ۲۰۱۸ء) میں پیش کیا ہے۔

حیدرآباد سے لاہور واپس ہونے کے سلسلے میں اقبال نے اپنے سوادخط میں بزبان انگریزی جو جدول بنالیا تھا اس کے مطابق ان کا سفر براہ دولت آباد طے تھا۔اقبال دولت آباد کو باضابطہ کوئی بڑا ریلوے اسٹیشن سمجھ رہے تھے جب کہ حیدرآباد سے روانہ ہوکر اورنگ آباد کے اسٹیشن پر اتر جانا پڑتا تھا۔اس زمانے میں اس طرف میٹر گیج پر گاڑیاں چلتی تھیں۔اقبال سمجھ رہے تھے کہ دولت آباد کے ریلوے اسٹیشن پر اتر کر وہ خلد آباد پہنچیں گے تاکہ اورنگ زیب عالم گیر کے مزار پر حاضری دے سکیں۔اقبال کے ٹرین کے سفر کا جدول کچھ اس طرح تھا:

۲۳/مارچ حیدرآباد سے روانگی رات آٹھ بجے۔ ۲۴/مارچ دوسرے دن صبح دولت آباد آمد، صبح چھ بج کر چودہ منٹ۔۲۵/مارچ دولت آباد سے روانگی صبح بج کر چودہ منٹ۔ ۲۵/مارچ پنجاب میل کے ذریعے منماڑ سے روانگی آٹھ بج کر تیئس منٹ رات۔ ۲۶/مارچ امبالہ آمدرات بارہ بجے کے بعد اپنے بھائی سے ملاقات کے اوقات بھی اقبال نے درج کررکھے تھے۔

عنایت علی صاحب کی تحقیق کے مطابق ''اقبال

چوبیس مارچ ۱۹۱۰ء کی صبح اورنگ آباد پہنچے، اسی دن وہ اپنے بھائی (عطا محمد) کے ہمراہ تانگے کے ذریعے خلدآباد گئے جو اورنگ آباد سے پچیس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اقبال مزار عالمگیر پر گئے اور وہاں فاتحہ پڑھی۔ مزار کے گرد قنات تھی۔ عطا محمد قنات کے اندر نہیں گئے اور کہا کہ میری داڑھی غیر مشروع ہے۔ یہ تفصیل اقبال نے اکبرالہ آبادی کو لکھے اپنے خط مورخہ سترہ دسمبر ۱۹۱۴ء میں دی ہے۔

''آج مہاراجہ کشن پرشاد کا خط آیا۔ معلوم ہوا کہ خواجہ نظامی حیدرآباد سے اورنگ آباد چلے گئے۔ خلدآباد کی زیارت مقصود ہوگی۔ میں بھی وہاں گیا تھا اور عالم گیر کے مزار پاک پر حاضر ہوا تھا۔ میرے بڑے بھائی بھی ساتھ تھے۔ کہنے لگے میں قنات کے اندر نہ جاؤں گا۔ (مزار کے گرد قنات تھی) میری داڑھی غیر مشروع ہے۔'' (اقبال کا خط بہ نام اکبرالہ آبادی مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۱۴ء) (اقتباس)

اورنگ زیب عالم گیر کے مزار پر اقبال کی حاضری کا ثبوت وہ خط بھی ہے جو اقبال نے اپنی قریبی دوست عطیہ فیضی کے نام سات اپریل ۱۹۱۰ء کو لکھا تھا جس میں والئی ریاست حیدرآباد نظام دکن کی بے اعتنائی سے بظاہر دل گرفتہ نہ ہونے کا اظہار بھی ہے۔ خط کا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''براہ کرم میری سیاست حیدرآباد سے متعلق کوئی حسب دل خواہ نتائج اخذ نہ کیجئے۔ مثلاً یہ اعلیٰ حضرت نظام میری قدرافزائی فرمارہے ہیں۔ اس معاملے میں خود میری تحریر کا انتظام فرمائیے۔ میں نے اتنا لمبا سفر صرف دوستوں سے ملنے کی خاطر اختیار نہیں کیا تھا' خصوصاً جب کہ میرے پاس قطعاً گنجائش نہ تھی۔ حیدرآباد کی سوسائٹی کے متعلق اتنا ہی کہوں گا کہ مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ میں نے کب اعلیٰ حضرت حضور نظام کی طرف سے اپنی قدرافزائی کو اپنے لئے سرمایہ افتخار سمجھا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے مجھے ان باتوں کی مطلق پروا نہیں۔ اگرچہ لوگ بدقسمتی سے مجھے بہ حیثیت ایک شاعر ہی کے جانتے ہیں لیکن میں شاعر کی حیثیت سے شہرت کا آرزومند نہیں ہوں۔ ابھی چند روز ہوئے مجھے نیپلز سے ایک اطالوی رئیسہ کا خط آیا تھا جس میں اس نے میری چند نظمیں مع انگریزی ترجمے کے طلب کی تھیں۔ لیکن شاعری کے لیے میرے دل میں کوئی ولولہ موجود نہیں اور اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوجاتی ہے۔

شاید حضرت عالم گیر پر جن کی مرقد منور کی میں نے حال ہی میں زیارت کی سعادت حاصل کی ہے، میری ایک نظم ہوگی جو میرے آخری اشعار ہوں گے۔ اس نظم کو لکھنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے اگر مکمل ہوگئی تو کافی عرصہ زندہ رہے گی۔ آپ کی باصرہ خراشی کافی ہوچکی۔

آپ کا ہمیشہ مخلص

محمد اقبال

جس نظم کو اقبال نے خود پر فرض قرار دے لیا تھا اُسے فرض کفایہ کی طرح بھی ادا نہ کیا البتہ مثنوی ''رموز بے خودی'' میں اورنگ زیب عالم گیر کے تعلق سے ایک ''حکایت شیر و شہنشاہِ عالم گیر رحمتہ اللہ'' میں اقبال نے بیان کی کہ جب ایک شیر عالم گیر پر حالت نماز میں حملہ آور ہوتا ہے

تو عالم گیر حالت نماز میں اپنے خنجر سے شیر کا پیٹ چاک کر کے اس جنگل کے شیر کو شیر قالین بنا کر رکھ دیتا ہے۔اسی حکایت میں اقبال نے اورنگ زیب عالم گیر کے بے در و دیوار بے سقف و بام گنبد سادہ کی تعریف میں کہا کہ اس کی تربت سے بھی اس کا فقر نمایاں ہے۔

درصفِ شہنشاہاں یکتاستے فقر آواز ترتبش پیدا ستے ''رموزی بے خودی'' کے اس شعر سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ اقبال نے عالم گیر کی تربت کی سادگی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔

اورنگ زیب کی لمبی عمر سے اس کا ایک بیٹا ابوالمعظم شا کی تھا وہ چاہتا تھا عالم گیر جلد دنیا سے اٹھ جائے تا کہ وہ بادشاہ بن سکے۔اس نے اپنے ایسے خیالات کا اظہار ایک نجی محفل میں کیا مگر مخبروں نے اس کی اطلاع اورنگ زیب کو دے دی جس پر اورنگ زیب نے اپنے بیٹے کو خط لکھا جس کو بنیاد بنا کر اقبال نے پیام مشرق میں ایک نظم لکھی:

''نامہ عالم گیر'' (بہ یکے از فرزندانش کہ دعائے مرگ پدر می کرد)

مپنداراں کہنہ نخچیر گیر
بدام دعائے تو گردد اسیر

ان دونظموں کے علاہ اقبال نے حسب آرزو اورنگ زیب عالم گیر کی مدح میں کوئی شاہ کار نظم نہیں کہی۔البتہ انہوں نے حیدرآباد و اورنگ آباد کے اپنے سفر میں کے بعد ۱۷/اپریل ۱۹۱۰ء سے انگریزی میں یادداشتیں لکھنا شروع کیں جن کا نام اقبال نے STRAY REFLECTION رکھا۔اقبال کی ان تحریروں کا ترجمہ ان کے بیٹے جاوید اقبال نے ''شذراتِ فکر اقبال'' کے نام سے ۱۹۶۱ء میں پاکستان سے شائع کیا۔ہندوستان میں پروفیسر عبدالحق نے مذکورہ انگریزی میں لکھی ۱۲۵۔سوا سو یادداشتوں STRAY REFLECTION کو ''بکھرے خیال'' کے عنوان سے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا جس میں بعنوان ''اورنگ زیب'' اقبال عالم گیر کے تئیں اپنے مخلصانہ جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہوئے اس کے تئیں تعصب کی مذمت بھی کی۔ THE PLITICAL GENIUS OF AURANGZEB WAS EXTREMELY COMPREHENSIVE متعصب ذہنیت کا جادو ایسا سر چڑھ کر بولنے لگا کہ پچاس برس تک بلا شرکت غیرے پورے ہندوستان پر کھلے دل و ذہن سے حکومت کرنے والے کے نام پر ایک معمولی شاہ راہ بھی کھُل گئی۔مندروں کو بھی گرانٹ دینے والے اورنگ زیب کی فراخ دلی کے تاریخی شواہد و دستاویزات کو منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے تا کہ لاعلم نئی نسل اپنے پرکھوں سے حقیقی معنوں میں واقف ہو سکے۔

بقول خیؔر

باہر پٹاریوں سے کئی سانپ آ گئے
منتر ہو یا عصائے تدارک سنبھال رکھ

اقبال نے اپنے کالج سے صرف دس دن کی

رخصت اتفاقی لے رکھی تھی ۔۱۸/مارچ ۱۹۱۰ء کووہ لاہور سے حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئے ۔حیدرآباد میں بمشکل ۲۰/مارچ سے ۲۳/مارچ تک رہے اور۲۳ہی کی رات وہ اورنگ آباد کے لئے روانہ ہوئے ۔وہاں دودن گزرے پھرممناڑ کے راستے پنجاب میل کے ذریعے لاہورپہنچ گئے اور ۲۹/مارچ ۱۹۱۰ء کورجوع بہ کارہوگئے ۔ ان کا یہ دورۂ حیدرآباد اورنگ آباد بڑے TIGHT SCHEDULE پرمبنی تھا ۔اس لئے وہ کئی مشاہیر کئی مقامات سے سرسری گزر گئے ۔واپسی میں عطیہ فیضی کی دعوت پرجنجرہ بمبئی بھی نہ جاسکے جس کی وجہ سے عطیہ فیضی ایک عرصہ تک اقبال سے خفا رہیں ۔

شیدائیان اقبال سے پورااورنگ آباد دکن بھرا ہواہے جنہوں نے نظم ونثر میں اقبال سے اپنی عقیدت کا اظہارکیا ۔سکندرعلی وجد،شفیق فاطمہ شعریٰ،عباس علی خان لمعہ ،وحیدہ نسیم،ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ،اخترالزماں ناصر، عبدالرؤف عروج،جے پی سعید،قاضی سلیم،وحیداختر، حمایت علی شاعر،انورمعظم،عنایت علی وغیرہ۔

ڈاکٹرعصمت جاوید نے اقبال کے فارسی کلام کا منظوم اردوترجمہ بھی کیاجیسے اسرارخودی ،لالہ طور، مجھے یاد پڑتا ہےعصمت جاوید نے اسرارخودی کاانگریزی میں بھی ترجمہ کیا تھا۔حکیم سیداحمدحسینی بےخوداورنگ آبادی نے بھی اقبال کی ایک آدھ نظم کامنظوم اردوترجمہ کیااوراقبال کومنظوم خراج عقیدت پیش کی ۔اخترالزماں ناصربھی اقبال کے کلام کے حوالے سے مضامین لکھتے تھےاورلیکچردیاکرتے تھے ۔

وجدنے اقبال کی حیات ہی میں ان پرنظم کہی تھی اوروفات پرمسدس کے فارم میں مرثیہ بھی لکھا تھا۔وجدنے علامہ اقبال سےان کتابوں پرمضامین لکھنے کی اجازت چاہی تواقبال نے وجدکولکھا کہ پہلے وہ غورسے یہ کتابیں پڑھ لیں تاکہ اقبال کےحقیقی مقاصدسےمکمل آگہی ہوسکے۔

ڈاکٹر رفیق زکریانے انگریزی میں IQBAL THE POET & POLITICIAN لکھی ۔ شفیق فاطمہ شعری کے بھی ئی غضنفراجہ نے اقبال کی بعض نظموں کی دل چسپ پیروڈیاں لکھیں۔

مختصر یہ کہ اورنگ آباددکن کے ادیبوں شاعروں کواقبال سے دلی لگاؤ رہااوراقبال کواورنگ آباد کی سرزمین سے یک گونہ انس تھا کہ ان کی محبوب شخصیت یہاں آسودۂ خاک ہیں۔

جناب عنایت علی ایگزیکٹیوانجینئر محکمہ آب پاشی موظف اورنگ آبادلائق مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اورنگ آباداوراقبال جیسےانوکھےموضوع پرداد تحقیق دی۔

ماخذ: اقبال اورنگ آباد مرتبہ عنایت علی ،محلّہ گھاٹی ،پرگتی کالونی،اورنگ آباد،دکن مہاراشٹرا ۴۳۱۰۰۱

☆☆☆

رباعی علامہ اقبالؔ

مکانی ہوں کہ آزادِ مکاں ہوں
جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں!
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست
مجھے اتنا بتادیں میں کہاں ہوں

ڈاکٹر مسعود جعفری
حیدرآباد

شاعر مشرق علامہ اقبال کی فکر ونظر کا نچوڑ

شاعر مشرق اقبالؔ کی سوچ نہایت بلند اور ارفع تھی۔آپ ملت اسلامیہ کی تعمیر نو چاہتے تھے۔اسے قعر مزلّت سے نکال کے عزت وعظمت کی بلندی تک لے جانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔آپ کی زندگی کا ایک ایک پل اسی سپنے کی تعبیر کی تلاش میں گزرا۔اقبالؔ سے پہلے یا بعد میں کوئی شاعر بھی ایسا نہیں ہوا جس نے نئے تصورات سے دنیائے شاعری کو روشن کیا ہو۔اقبالؔ نے انسانیت کی راہوں میں عزم و ہمت کے ستارے بکھیر دئے۔اقبالؔ سرمایہ داری اور اس زرداری نظام کے نکتہ چیں تھے جس میں شریف انسان گھٹ کر ایک جنس یاCommodity میں تبدیل ہو جاتا ہے۔وہ اسلامی سادگی و پاکیزگی کے غماز رہے۔ان کے پاس دولت نہیں فقر کی اہمیت و رفعت تھی۔وہ فقر کی عظمت کا اعتراف یوں فرماتے ہیں۔یہ شعر نہیں نوائے سروش ہیں۔ذہن میں ہلچل اور روح میں کرب واضطراب پیدا کر دیتے ہیں۔اقبالؔ کے فقر کاConcept یا نظریہ دیکھئے:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی سرمایہ شبیری

اقبالؔ کے یہ زرّین خیالات تاریخی واقعات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔اک فقر کی دلگیری وغم نا کی اس وقت آشکار ہوگئی جب ہلاکو 1258 میں شہر بغداد پر حملہ آور ہو رہا تھا۔اس وقت صوفیا کہہ رہے تھے کہ ہمیں کچھ نہیں کرنا ہے' خدا بغداد کا محافظ ہے۔ہلاکو نے بغداد کو تاخت وتاراج کر دیا۔شہر کو بے چراغ کر دیا۔شہر خموشاں بنا دیا۔اقبالؔ شعور و ادراک سے معمور حرکت و انقلاب سے لبریز تصوف کے داعی رہے۔وہ شہید کربلا کے فقر کو تسلیم کرتے ہیں اور اسے مسلمان کی میراث مانتے ہیں۔ اسوہ حسینی کو اپنانے کی تلقین فرماتے ہیں۔

اقبالؔ سامراجیتImperialism کے خلاف تھے۔ وہ اسے لوٹ کھسوٹ،ڈاکہ زنی،ظلم وستم اور استحصال والا نظام تصور کرتے تھے۔وہ مقدونیہ یونان کے سکندر اعظم کے جاہ وجلال جبروت اور تزک واحتشام کو

ناکارہ سمجھتے تھے۔اس کی شان وشوکت عوام سے خراج لینے میں مضمر تھی۔سکندر کی شاہی کو اقبال تسلیم نہیں کرتے۔اس کی بادشاہی پر سوال کرتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ یہ کیسی شہنشاہیت ہے جو عوام الناس کے پیسوں سے چلتی ہے۔اقبالؔ کا انتہائی بلیغ خیال دیکھئے:

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

ooo

اقبالؔ امیری و شاہی کی عظمتوں کے قائل نہیں۔اس کے برعکس وہ فرماتے ہیں:

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرے کیا ہیں شاعری کیا ہے

ooo

پورا شعرا اسلامی اسپرٹ سے معمور ہے۔شرف انسانی کی اس سے بڑھ کر اور کیا تفسیر ہوسکتی ہے۔مغرب مشرقی اقدار پر چیں بہ جبیں رہتا ہے۔وہ اپنی فکر کو مسلط کرنا چاہتا ہے۔وہ مشرقی علم وآگہی کی بہت ناقدری کرتا ہے،جیسا کہ گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنگ کی کونسل کے ممبر لارڈ میکالے نے 1835 میں یہ بدبختانہ اعلان کیا کہ سنسکرت،عربی و فارسی کی ساری کتابوں کو دریا برد کر دینا چاہیئے' ان تمام علوم و کتب کے عوض انگریزی کتابوں کا ایک شلف کافی ہے۔باقی رطب و یابس ہے۔اس نسلی، مذہبی،لسانی وثقافتی تعصب وتکبر کی نفی کرتے ہوئے اقبالؔ کہتے ہیں:

جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانہ فرنگ
وہ شے متاع ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

ooo

اس سے اچھا اور مناسب جواب اقبالؔ کے سوا اور کون دے سکا۔وہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو رہزنوں کی تجارتی کمپنی تصور کرتے تھے۔اس کے ہرکاروں کو ہندوستانیوں کے فنون لطیفہ شاعری،مصوری،موسیقی،سنگ تراشی اور رقص کو تباہ و برباد کرنے والے سمجھتے تھے۔یہ ایک تاریخی حقیقت بھی رہی ہے۔اقبال کہتے ہیں:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

ooo

اقبالؔ نے طنز وظرافت کے پیرایہ میں بڑی گہری فکر انگیز بات کہہ دی۔

اقبالؔ کے ہاں عقل وخرد کے بجائے دل و نگاہ کی اہمیت ہے۔وہ ایک مقام پر یوں گویا ہوئے ہیں:

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

ooo

خرد کو اقبالؔ اطلاع یا Information کا مرکز سمجھتے ہیں۔اس کے برعکس وہ نظر کو تمام بیماریوں کا علاج خیال کرتے ہیں۔اقبالؔ کے تخیل کی پرواز کا مشاہدہ کیجئے:

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ooo

حضرت ابراہیم و اسماعیل یعنی والد و پسر کے تعلقات کے پس منظر میں کہا گیا یہ شعر دیکھئے:

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

ooo

اس تاریخی نوعیت کے شعر میں بھی اقبالؔ نظر کے فیوض و برکات کو آشکار کرتے ہیں۔ اقبالؔ کے مشہور زمانہ مصرعہ کی آفاقیت جھلک رہی ہے:

نگاہ مردمومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ایک جگہ اقبال انسانی قافلے کے رہنما کے لئے ارشاد فرماتے ہیں:

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

ooo

شاعر مشرق کے پاس عقل و خرد منزل مقصود تک جانے سے عاجز ہیں۔ اس لئے وہ عقل کو چراغ راہ کہتے ہیں۔ ان کا یہ فلسفیانہ نقطہ نظر دیکھئے۔ وہ راہی کو یہ پیام دے رہے ہیں:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

اقبالؔ خدا سے بھی شکوہ کرتے ہیں اور یہ اس سے کہہ رہے ہیں:

نہ دیا نشان منزل مجھے اے حکیم تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

ooo

بہت بڑی بات ایک شعر میں سمودی ہے۔ خدا عرش اعلیٰ پر متمکن ہے۔ وہ نہ رہ نشیں ہے اور نہ ہی راستہ کا مسافر ہے۔ ایسی غیر مرئی شخصیت سے کیا گلہ کیا جا سکتا ہے۔ گلہ تو ہم نفسوں، ہم سفروں سے کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں ایسے عظیم خیالات اقبالؔ کی شاعری ہی میں ملتے ہیں۔ اقبالؔ کا وژن ہمہ گیر ہے۔ ایسی فکری بلندیاں ہمیں کہیں اور نہیں ملتیں۔ اُردو کی خوش بختی ہے کہ اسے اقبالؔ جیسا کیمیا گر شاعر نصیب ہوا۔

☆☆☆

ذرائع ابلاغ کے کارنامے

یہ ذرائع ابلاغ کیا ہے؟ یہ میڈیا کیا ہے؟ انسان کو اتنا مگن کردو کہ اسے کبھی خیال ہی نہ آئے' وہ کبھی یہ سوچ ہی نہ سکے کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جانا ہے؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ کھیل کود یہ ٹور نمنٹ' آج فلاں میچ ہے' کل فلاں میچ ہے' اور پھر یہ فلمیں' ڈرامے' ان کے اداکار اور اداکارائیں' ان کی زندگیاں پھر ان کے اسکینڈلز' انسانوں کو ان ہی چیزوں میں اتنا مست کردو' خاص طور پر نوجوان نسل کو اتنا کمزور کردو کہ وہ حقیقت کے بارے میں سوچ ہی نہ سکیں

oOo

ڈاکٹر بلال احمد میر
اسسٹنٹ پروفیسر، کشمیر

شکارگاہ
تحصیل ٹرال، ضلع پلوامہ، جموں وکشمیر192123

اقبالؔ کی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی شعری کائنات کی عصری معنویت

علامہ اقبال کو کسی خاص وقت اور دائرے میں محدود نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ انہوں نے جس ایمانداری سے انسانی زندگی اور اس کے مسائل کی کی عکاسی اپنی شاعری میں کی ہے اس کی مثال ان کے پیش روؤں کے یہاں نہیں دکھائی پڑتی ہے۔ جہاں تک ان کے افکار ونظریات کی عصری معنویت کا سوال ہے تو ان کی شاعری اور نثری تخلیقات میں وہ علمی اور فکری سرمایہ موجود ہے جس کی مدد سے ہم اکیسویں صدی یعنی عہد جدید میں بھی ذہنی سکون حاصل کر سکتے ہیں اور ان طاقتوں کو اپنی گرفت میں لا سکتے ہیں جن کے ذریعے اپنی فکر ونظری پسماندگی اور بے کسی کا ازالہ کرسکیں۔اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بھی بدلتے حالات میں علامہ اقبال کی شاعری کی معنویت عصر حاضر میں کار آمد اور نمایاں ہے۔مختصر یہ کہ اقبالؔ ایک کیفیت کے شاعر ہیں۔ لمحوں کا ذاتی مشاہدہ ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کی شاعری احساس فطرت اور احساسِ انسانیت کا حسین امتزاج ہے اور حساس فطرت اور احساس انسانیت کی شاعری وقت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔محمد سہیل عمر اپنے ایک مضمون میں ''اقبال۔ فکری تناظر اور عصری معنویت'' میں یوں رقم طراز ہیں:

'' علامہ اقبالؔ کی وہ کون سی حسّیات ہیں جو اس معنویت کا تعین کرنے کے لیے صرف آج، اکیسویں صدی ہی نہیں بلکہ زمانے کی قید سے آزاد ہو کر، مستقل رہنے والی بنیادیں فراہم کرتی ہیں؟ وہ کون سی ایسی پائدار کائناتی، عالمگیر بنیادیں فراہم کرتی ہیں جو دائمی ہیں، جن پر آپ بڑی شاعری کو، بڑے ادب کو، بڑی فکر کو ہمیشہ پرکھ سکتے ہیں، اس سے بامعنی تعلق استوار کر سکتے ہیں اور اپنے لیے اس کی معنویت تازہ رکھ سکتے ہیں؟ وہ ادبی معاشرہ جو اپنے آپ سے یہ سوال کرنے لگے، یا اقبال سے عدم دلچسپی کا خوف انہیں ستانے لگے، ان کو یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ اس میں نقصان کس کا ہے۔ اس ادبی معاشرے کا اور اس نسل کا جس کے اندر یہ سوال، اتنا چبھتا ہوا سوال بن گیا ہے۔علامہ اقبال کی یہ تین حسیات اگر سمیٹ کر بیان کی جائیں تو کچھ یوں ہوں گی: اسلامی تہذیب کے اسلوب بیان میں تصورِ خدا، تصور کائنات اور تصور انسان۔ نیز ان کے باہمی رابطہ کو اعلیٰ ترین فکری اور ادبی سطح پر ایک نہایت بامعنی اور پرتاثیر بیان میں ڈھال کر عہدِ جدید میں اقبال کی شاعری اور فلسفیانہ تحریروں نے پیش کیا۔''

(اقبالیات: محمد سہیل عمر، جولائی ۲۰۱۰ء ص،۳)

علامہ اقبالؔ کے فکری سفر کا محور جہانِ نو کی تلاش تھی۔ عصر حاضر نے دنیا کے سامنے بہت سارے نظریات پیش کیے۔ اقتصادی سماجی و معاشی اور سیاسی فلاح و اصلاح کے نئے نئے دروازے وا ہو رہے تھے۔ علامہ اقبال اس ساری صورت حال کو نہ صرف محسوس کر رہے تھے بلکہ بیسویں صدی میں ابھرنے والی علامہ کی متحرک، توانا اور تابندہ فکری شخصیت اکیسویں صدی کے پر آشوب عالمی منظرنامے میں بہت زیادہ معنویت رکھتی ہے۔

علامہ اقبال کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کی عصر شناس فکر نے عالمی سطح کے دانشوروں اور فلاسفروں کو نہ صرف پڑھا بلکہ ان کو اپنا موضوع بھی بنایا۔ اس سے نہ صرف انہیں نئی منزلوں کا شعور ملا بلکہ فلسفے کی گتھیاں سلجھانے میں بھی مدد ملی اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنے شعری جہاں میں عصری معنویت کا پہلو پیش کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

عصر حاضر نے بہت سارے نظریات دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں۔ اقتصادی، سماجی، معاشی اور سیاسی فلاح کے نئے نئے نقطہ ہائے نظر اور مسالکِ فکر اپنے مثبت اور منفی رویوں کے ساتھ پیش ہو رہے ہیں مگر تجربہ بتا رہا ہے کہ اپنی کجروی، بدگوئی، بے ضمیری اور ہوس رانی کے نتیجے میں یہ نظریات وقت کی رفتار کے ساتھ اپنی معنویت کو بدلتے رہے۔ جس طرح اقبال کی ''شکوہ جواب شکوہ'' نظم آج بھی مسلمانوں کے حالات کی اس طرح ترجمانی و عکاسی کرتی نظر آتی ہے جیسے کہ:

جرأت آموز میری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو
خوگر حمد سے تھوڑا سا گِلہ بھی کر لے

اس نظم کا نام ''شکوہ'' اس لیے رکھا گیا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے شکوہ بارگاہ الٰہی میں علامہ اقبالؔ یا دور حاضر کے مسلمانوں کی ایک فریاد ہے۔

اس وقت محض عہد حاضر کے فکری بحران میں اقبالؔ کی ضرورت کا جائزہ لیا جاتا ہے، تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ بند گلی میں پہنچ جانے کے بعد اکیسویں صدی کے انسان کو فکر اقبالؔ کی مدد سے کوئی راہ سُجھائی دیتی ہے یا نہیں۔

ابلیس کی مجلس شوری میں لکھتے ہوئے اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ عہد حاضر کی سنگینی پر پوری طرح صادق آ رہے ہیں۔ اقبالؔ نے سرمایہ دارانہ نظام کی شان میں ابلیس کے خیالات پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں
کون کر سکتا ہے اس کی آتش سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

یہی سرمایہ داری ہے جس نے اول اول قوم پرستی اور پھر اس کی بنیاد پر جدید وطنیت کا پرچار کیا۔ یہی سرمایہ داری کروڑوں انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنی، یہی سرمایہ داری بنی نوع انسان کی وحدت کو پارہ پارہ

کرتی ہے۔

علامہ اقبالؔ یہ محسوس کر چکے تھے کہ مسلمانوں کی بدحالی سرمایہ درانہ نظام کی پیداوار تھی' لہٰذا ان کی مشکلات کا حل اس نظام میں تو بالکل بھی نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کا پختہ ایمان تھا کہ یہ نظام ایک نہ ایک دن نیست و نابود ہوجائے گا اور اس کی جگہ ایک ایسا نظام آئے گا جو امتیازات سے بالاتر ہوگا۔

زندہ کرسکتی ہے ایران وعرب کو کیوں کر
یہ فرنگی مدنیت ہے کہ جو ہے خود لبِ گور

علامہ اقبالؔ کی شاعری اوران کی ذاتی علمی، ادبی، سیاسی تحریروں کا ایک بہت بڑا حصہ آزادی وحریت کی کوشش اور غلامی ومحکومی کی مذمت سے عبارت ہے۔ وہ حرف راز جو انہیں ''جنوں'' نے سکھایا تھا، اور جس کو زبان پر لانے کے لیے انہیں 'نفسِ جبریل' کی ضرورت تھی، یا خودی یا آزادی کی ضرورت تھی۔ دیکھا جائے تو خودی اور آزادی ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

دور حاضر میں اقلیتی طبقوں کو'' قوم پرستی'' کے نظامِ فکر نے جس طرح جکڑ کر رکھا ہے' اقلیت پر یہ خطرہ دنیا کے ہر کونے میں منڈلاتا دکھائی دیتا ہے۔ بغور مطالعہ کیا جائے تو اقبالؔ کے یہاں غیرمسلم اقلیتوں کے تمام سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی حقوق کی بحالی کو شرط اول قرار دیتا ہے۔

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

تہذیبوں کے درمیان مذاکرہ ومکالمہ کا راستہ یہی احترام آموز رویہ ہموار کرنا ہے۔ اقبالؔ ہرنوع کے جنگ و جدال کی نفی کرتے ہوئے محبت اور دل نوازی کو فاتح عالم قرار دیتا ہے۔ یہ نہایت اور بلیغ خوب صورت شعر دیکھئے:

بہ ملازمان سلطان خبری و ہم زرداری
کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دل گذاری

ان کے اشعار میں امن کا پیغام خوب چھلکتا ہے۔ اقبالؔ کو یقین ہے کہ زمین پر صلح وآشتی کا ایک انقلابی اور منفعت بخش نظام آ رہا ہے جو نسل انسانی کی بقاء کا ضامن ہوگا۔ وہ اس مثبت نظام کو'' لا'' سے تعبیر کرتے ہیں:

درمقام ''لا'' نیا ساید حیات
سو ی ''لا'' می خرامد کائنات

اقبالؔ نے اردو شاعری کی لفظیات میں ایک عظیم تغیر پیدا کردیا اور شعری معنویت کے رشتے عصری حقائق اور تاریخ وتہذیب کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ استوار کردیے۔ انہوں نے شاعری کو فلسفہ کی زندگی عطا کی اور مغربی افکار کے مقابلے میں مشرقی فکر کے حیات بخش عناصر کو اس طرح نمایاں کیا کہ اس سے مغرب اور مشرق دونوں کو نئی روشنی میسر آسکے۔ انہوں نے شاعری کو استدلال دیا اور استدلال کو منطق کے بے جان کلیوں سے نکال کر زندگی کی حقیقتوں کے قریب لایا۔ شعری معنویت کے جن نئے امکانات کو انہوں نے اپنی شاعری میں منکشف کیا اس کی مثال اُردو شاعری ہی

میں نہیں بلکہ پوری دنیائے ادب میں ملنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر سلیم انصاری اپنے ایک مضمون ''اقبال عہد آفرین'' میں اقبال کی شاعری کے عصری معنویت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''اقبالؔ نے اردو شاعری کی لفظیات میں ایک عظیم تغیر پیدا کر دیا، اور شعری معنویت کے رشتے عصری حقائق اور تاریخ وتہذیب کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ استوار کر دیئے۔ انہوں نے شاعری کو فلسفہ اور فلسفے کو زندگی عطا کی اور مغربی افکار کے مقابلے مشرقی فکر کے حیات بخش عناصر کو اس طرح نمایاں کیا کہ اس سے مشرق اور مغرب دونوں کو نئی روشنی میسر آ سکے۔''

(اقبال: عہد نامہ، ڈاکٹر اسلم انصاری، ص ۱۳)

1970ء کی دہائی میں ہم فخریہ انداز میں مغرب کو یہ بتاتے تھکتے نہ تھے کہ ہم امداد کے نہیں تجارت کے خواہاں ہیں۔(we want trade , not aid) مگر عصر حاضر میں مغرب نے ہمہ عالمگیریت (Globalisation) کی نادر اور استبدادی شکل میں تجارت ہی کا پھندا ہماری گردنوں میں ڈال دیا ہے اور ہم بے بسی کی حالت میں کبھی اپنی طرف اور کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں:

نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن

اس پس منظر میں جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ علامہ کی اقتصادی فہم و بصیرت ہم سے کہیں زیادہ پختہ تھی کہ انہوں نے ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ہی ہمیں بتایا تھا کہ عصر حاضر کی ملوکیت اور چیرہ دستی تجارت ہے:

خود بدانی بادشاہی قاہری است
قاہری در عصر ما سودا گری است
شیوۂ تہذیبِ نو آدم دری است
پردۂ آدم سودا گری است

موجودہ عہد تک آتے قبضہ صرف اتنا نہیں رہتا کہ اقبالؔ مذہبی روایات کو جس قرینے سے برت رہے تھے، اس میں ان کا مفہوم جدید زمانے سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور ان میں نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج کے عہد سے مستعمل معنی بلکہ ''مسجد فرشتوں'' ''کلیسا دوستوں'' اور فرنگی تخیلات'' کو عزیز تر رکھنے والے سارے گروہوں کی اصل الجھن یہ ہے کہ اقبالؔ انہیں رد کرتے ہیں اور وہ اسلام کی اصل روح کو بحال کر کے مذہب کو جمادات و نباتات کی سطح پر لے آنے والے ملا سے چھین کر اس سے مرد ان خدا مست و خود آگاہوں کا مذہب بنانا چاہتے ہیں۔ اقبالؔ کا یہ کہا ذہن نشین رہے۔

بگڑے ہوئے ملا کے بپا کئے ہوئے فساد ہر مذہب میں ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں۔ آج کے دور میں یہ فساد ہر مذہب میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ اس شعر کے معنی بھی عصر حاضر میں ہر برپا کئے ہوئے فساد کی اکسیر معلوم ہوتے ہیں۔ تاثیر ۱۹۳۸ء اپنے ایک مضمون میں علامہ اقبالؔ کی شاعری کی عصری معنویت پر یوں رقم طراز ہیں:

''وہ پرانی روایات کو اس طرح برتتا ہے کہ ان کا مفہوم بدل جاتا ہے اور ان میں نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جب کبھی اقبالؔ ابراہیم خلیل کا ذکر کرتا ہے تو وہ یہودیوں

عیسائیوں اور مسلمانوں کے ایک نبیؑ نہیں ہوتے بلکہ شاعر کا تصور جنگ آزادی کا مجسمہ بنا دیتا ہے اور آذر کے بت غلامی اور توہمات کی تمثیل بن جاتے ہیں جنہیں توڑ کر انسانیت کا دعوے دار ہوسکتا ہے ''ایسے خلیل'' کو فرقہ واری کا نشان سمجھنا بدترین فرقہ ذہنیت کی نشانی ہے یہ تو وہ خلیل ہے جو عشق کا مجسمہ ہے وطن کا، آزادی کا، عشق کا جس کے متعلق اقبال نے کہا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی''

(اقبال۔نثر تاثیر ''مرتبہ فیض احمد فیض)

علامہ اقبالؔ کا یہ شعر بھی عصری معنی کے لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ بنی نوع انسان ہمیشہ تسلط کا شکار رہا ہے اور آج بھی چھوٹی اقوام بڑی قوتوں کے زیر تسلط کا شکار ہیں۔یہ شعر غلامی کی زنجیروں میں جکڑی اقوام کی ترجمانی قیامت تک کرے گا۔

اقبالؔ ایک بڑے انسان دوست شاعر اور مفکر ہیں۔ان کا دل تمام انسانیت کے لیے دھڑکتا ہے۔وہ تمام انسانیت کی بہتری کے خواہاں ہیں۔انہوں نے تمام نوع انسانی کو اخوت اور محبت کا پیغام دیا ہے:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا محبت کی زباں ہوجا

اقبال ایک ایسا انسان دوست شاعر ہے جو محدود وطن پرستی اور ہر نوع کے مذہبی و نسلی تعصّبات کی مذمت کرتا نظر آتا ہے۔وہ مذہب کو ایک قومی ترین سماجی اور روحانی طاقت سمجھتا ہے۔اس حکیم انسانیت کے نزدیک کوئی مذہب آپس میں عداوت، نفرت اور بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔اقبالؔ کا مذہب آدمی کو سراپا محبت بنا کر بے کراں ہونے کا درس دیتا ہے۔آج کے فرقہ وارانہ ماحول کے پیش نظر بھی ان کی شاعری میں عصری معنویت کی اہمیت ہے۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی ماہر اقبالؔ ہیں۔وہ اپنے ایک مضمون میں ان کی شاعری میں سماجی عصری معنویت کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''عصر حاضر یقیناً اپنی تمام تر برق رو تجارات کی ترقیات کے ساتھ آگے کی طرف گامزن ہے۔لیکن اسی رفتار پر اقبالؔ کی نظر میں فیضان سماوی یا بالفاظ دیگر دانش روحانی سے محروم ہو رہا ہے۔فکر، معاش، ترجیحات، شکم، حلب زد، طمع دنیا، ہوس، تفوق، نسبتی بالاتری، جھوٹی سیاست اور منافقانہ اندازِ فکر و نظر وہ عصری افکار و اخلاق ہیں، جن کے خلاف ''ضرب کلیم'' کی پیشانی پر اقبالؔ نے اسّی سال پہلے کیا تھا حالانکہ تب کچھ قدریں باقی تھیں۔آج وہ زندہ ہوتے، پتہ نہیں ان کے قلم سے کس نوعیت کے آتش باز اشعار نکلتے۔''

Media matters , ayazmedia .blogspot .com dated 22 april .2012

سیاست ایک اجتماعی انتظامی سطح پر داخلی بھی ہوسکتی ہے اور بین الاقوامی بھی، اسی قوت کا ظہور ہے۔ایک نظریاتی معاشرے میں جہاں نظریہ عمل سے نہیں بلکہ عمل، نظریے سے پیدا ہوتا ہے۔کائنات کی سیاسی تنظیم کے سلسلے میں جب بھی

مفکروں نے غور کیا ہے تو اقدار انسانی کے حفظ و بقا کے پہلو کو مدنظر رکھا ہے کیوں کہ اس کا اصل سرمایہ وہی قدریں ہیں جو اسے شرف انسانیت سے ہم کنار کر کے کائنات کی دوسری مخلوقات سے ممیّز اور سرفراز کرتی ہیں۔

اقبالؔ مغربی سیاست کی زائدہ اس جمہوریت کو انسانیت کے حق میں رحمت و برکت کی بجائے لعنت تصور کرتے تھے۔ ان کے خیال میں اس نظام پر مبنی حکومت انسان کو صرف انسان کا غلام ہی نہیں بناتی بلکہ اس کے ضمیر کو بھی مردہ بنا دیتی ہے۔اس لیے وہ اس سے حریت کی اصطلاح میں ''اندھی سیاست'' سمجھتے تھے۔ یہ بات بظاہر معمولی لگتی ہو یہ الگ بات ہے لیکن جب شاہان سرمایہ نے محسوس کر لیا اجارہ داری کے دن برائے جمہور میں سیاسی بیداری کی لہر تیز ہونے لگی تو انہوں نے ملوکیت کے تار تار لبادے کو اتار کر جمہوریت کے زرنگار لباس زیب تن کر لیے جو معصوم اور بھولے بھالے عوام کے لیے دھوکے کی ٹٹی کے مترادف تھے۔اس بہروپ کی نشاندہی ابلیس کے مکالماتی انداز میں اس طرح کی ہے:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

اقبالؔ کے اس سیاسی تجزیہ کار ''جاوید نامہ'' بال جبریل، ضرب کلیم، مثنوی پس چہ باید کرد، اور آخری تصنیف ''ارمغانِ حجاز'' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ مغربی جمہوری نظام فاسد اور اخلاق باختہ ہے اور بنی نوع انسان استحصال اور غلامی کی دلفریب زنجیر تھی۔ اس طرزِ حکومت سے عوام کے حوصلے سرد پڑ جاتے ہیں۔ان کی آرزوئیں اور امیدیں شل ہو جاتی ہیں جو زمانے کے ہر سیاسی باب میں موجود ہیں اور موجود رہیں گی:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

عصر اقبالؔ کا سب سے بڑا دکھ غلامی کا تھا، غلامی نے دانش کی ہر سطح پر اپنا اثر دکھا تھا۔غلامی چوں کہ بنی نوع انسان کے آغاز سے ہی وجود میں آئی ہے اور اس کا وجود ہر زمانے میں پایا جاتا رہے گا۔اس لیے اقبالؔ کی ایک نظم ''پرندے کی فریاد'' اپنے اندر ہر زمانے کے لیے معنی پنہاں رکھی ہوئی ہے۔ یہ نظم احتجاج کی ایک خوب صورت آواز کے ساتھ مزاحمت کے حدود کو چھوتی ہے جس کا اثر عصر حاضر کے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے:

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اقبالؔ کی شاعری میں ملاؤں کے خلاف احتجاجی آواز کی وہ لے دکھائی دیتی ہے جو ہر زمانے کی عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ آواز معنیٰ کے اعتبار سے قید و بند سے آزاد ہے جو ہر زمانے میں فرسودہ خیالات کے لیے بطور احتجاج معلوم ہوتی ہے جیسے کہ کوتاہ بین ملاؤں اور کم اندیش

استادوں نے خدا کا تصور خوف، ڈر اور شک وشبہ کے ساتھ عجیب وغریب بنا کر پیش کیا ہے:

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

دین خدا سے مہجوری کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے جمال سے آشنائی اور اس کی ذات کی بے کراں حقیقت کے وصل کی خواہش اور طلب کا نام ہے:

ربط و ضبط ملت بیضا سے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

مذہب اور فلسفۂ فکر اور وجدان کے درمیان ارتباط ثابت کرنے کے بعد ہی اقبالؔ کے لیے اسلامی فکر کی جدید خطوط پر تعمیر نو ممکن ہوسکتی ہے۔ لیکن اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ اقبالؔ نے فلسفے اور مذہب کو برابر کا رتبہ تفویض کر دیا ہے۔ بظاہر اقبالؔ کے فکری نظام (اگر اسے فکری نظام کہا جا سکتا ہے تو) میں انسانی زندگی کی ہمہ جہت اور مسلسل ترقی اور نشوونما کے سلسلے میں داخلی علم (inner knowledge) کو اعلیٰ مقام حاصل ہے:

زا انجم تا بہ انجم جہاں بود
خرد ہر جا کہ پر زرد آسماں بود
ولیکن چوں بخود نگر تم من
کراں پیکراں درمن نہاں بود
(پیامِ مشرق)

چناں چہ اقبالؔ نے عقل کے بارے میں کہا کہ:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے
(بالِ جبریل)

اور پھر عشق اور عقل کا موازنہ کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ:

غریباں را زیرکی ساز حیات
شرقیاں را عشق راز کائنات
زیرکی از عشق گرد و حق شناس
کار عشق از زیرکی محکم اساس

عشق، ایمان اور داخلی فکر ایسی اصطلاحات ہیں جو فلسفے سے زیادہ مذہبی فکر میں مستعمل ہیں۔ لیکن اقبالؔ نے جیسے مذہب کی تصویر کشی کی ہے وہ روشن ضمیر اور ترقی پسندانہ زندگی کا ایک ایسا ضابطہ بھی پیش کرتا ہے جس میں انسان کے لیے دنیا اور عاقبت، ہر دور میں لامحدود امکانات پائے جاتے ہیں۔ دراصل اقبالؔ کا تمام فلسفہ مقصدیت، حقیقت پسندی اور پیہم سعی وعمل کو فکری اور منطقی بنیادیں فراہم کرنے کی ایک جرأت مندانہ کوشش ہے۔

عورت کے متعلق علامہ اقبالؔ کے ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن کی معنویت ہر زمانے کے لیے عورتوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ وہ اپنی ایک نظم ''عورت'' کا آخری شعر کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس شعری تجربے کا مفہوم ہر زمانے میں ایک نئی خوشبو سے مہکتا رہے گا جو ہر دور کی اکسیر معلوم ہوتی رہے گی:

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

اقبالؔ ملت اور وحدتِ ملّت کے نہایت وسیع و عریض تصور کے پیغام بر ہیں۔اس لیے ان کی شاعری میں ملی جذبات سے لبریز شاعری میں عصری معنویت یوں بیان ہوتی ہے۔ان کی شاعری میں عصری معنویت کے بارے میں پروفیسر محمد فخرالحق نوری اپنے ایک مضمون ''اقبال کا پیغام وحدتِ ملّی اور اس کی فکری اساس'' میں یوں رقم طراز ہیں:

'' حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ کا پیغام ملّت کی شیرازہ بندی کا پیغام ہے۔ وہ جس وحدت ملّی کے موید و علمبردار ہیں، عصر حاضر میں اس کی معنویت پہلے سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔ نائن الیون کی صیہونی سازش کے نتیجے میں عالم اسلام کو مسلسل جن مشکلات سے گزرنا پڑرہا ہے وہ ورلڈ آرڈر کا سیاہ باب ہیں۔عراق اور افغانستان پر فوج کشی کا معاملہ ہو یا فلسطین کا مسئلہ، ایران پر جوہری توانائی کے حصول کی پاداش میں پابندی عائد کرنے کی بات ہو یا دہشت گردی سے پاکستان کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش، ہر صورت میں نشانہ تو ملت اسلامیہ ہی کو بنایا جارہا ہے۔ ساتھ ساتھ مسلمانوں کو فروعی مسائل میں الجھا کر انہیں اپنی اصل سے دور کرنے اور ان کی ملّی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی منظّم کوششیں بھی جاری ہیں۔ ہوش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کوششوں اور مذموم عزائم کو کسی بھی طور کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔''

(پروفیسر محمد فخرالحق نوری،''اقبال کا پیغام وحدتِ ملی اور اس کی فکری احساس'' مجلّہ تحقیق نامہ،ص،۲۵،شعبہ اردو جی سی یونی ورسٹی لاہور پاکستان)

اقبالؔ بھی مروّجہ جمہوری نظام یا سامراجی جمہوریت پر اس لیے معترض ہیں کہ جمہور کے نام پر قائم ہونے والے نظام میں حقیقتاً جمہور کے مفادات کو پس پشت ڈال کر بالادست طبقوں کے مفادات کو تحفظ حاصل ہوتا ہے:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
گرمیٔ گفتار اور عضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ

ooo

جمہوریت کے نام'' جنگ زرگری'' دراصل اقبالؔ کی تنقید کا اصل ہدف ہے۔ان اشعار میں بھی عصری معنویت کچھ اس طرح بیان ہوئی ہیں۔ڈاکٹر جاوید اقبال ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

'' اقبالؔ اسلام کی روح کے مطابق جمہوریت چاہتے تھے اور عہد حاضر میں اسلام کو درپیش چیلنجوں کی روشنی میں اقبالؔ کے پیغام کی نئی تشریح کی ضرورت ہے لیکن روحانی جمہوریت کی تشریح وتوضیح میں کوئی واضح بات نہیں۔''

(روزنامہ''جنگ''لاہور،۱۰نومبر،۲۰۰۳)

اقبالؔ کا فن شاعری پر دسترس کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے بعض ظریفانہ اشعار کو مزید پراثر بنانے کے لیے مناسب مواقع پر قرآنی آیت سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ مثلاً سرمایہ داروں اور اشتراکیوں کے مابین کشمکش کو واضح کرنے کے لیے تین اشعار پر مشتمل ایک قطعہ کے

دوسرے شعر میں سورۃ یونس کی آیت ۵۱ اور تیسرے شعر میں سورۃ النباء کی آیت ۹۶ کے ایک لفظ کا بھر پور انداز میں استعمال کیا ہے:

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آراء ہو گئے
دیکھئے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنہ آشوب کا خون

اقبالؔ کے نزدیک سیاست عبادت ہے۔ اقبالؔ کی نظر میں سیاست آزادی ہے اقدام ہے۔ سیاست ان کے نزدیک حیات ملی کے شعور کا نام ہے' اس لیے سیاسی بصیرت سے ہی اس نصب العین کی جد و جہد کی جا سکتی ہے جس سے ہمارا مستقبل وابستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبالؔ جس دین کو سیاست کا حصہ بنانا چاہتے ہیں وہ مُلّا کا دین نہیں بلکہ اقبالؔ کا تصورِ دین وسیع معنیٰ رکھتا ہے۔ وہ رواداری کا قائل ہے۔ آپ کے نزدیک ''توحید'' کا مطلب انسانی اتحاد مساوات اور رواداری کی بنیادوں پر زمان و مکان کے اندر ایک مثالی معاشرہ وجود میں لانا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الہ آباد میں آپ نے فرمایا تھا کہ مجھ پر اقلیتوں کی عبادت گاہوں، قوانین اور تمدن کے تحفظ کا فرض عائد کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں آپ نے کہا ہے کہ اسلام کا اصل مقصد (روحانی جمہوریت) کا قیام ہے۔

اقبالؔ ایک عملی سیاست دان کی حیثیت سے دو مختلف موقعوں پر تسلسل سے سیاست کے کارزار میں کام کرتے رہے۔ پہلے موقعہ پر انہوں نے بحیثیت عملی سیاست دان کام کا آغاز اس وقت کیا جب وہ ۱۹۲۷ء میں پنجاب لجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ اور دوسرا موقعہ وہ تھا جب انہیں ۱۹۳۱ء گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن مدعو کیا گیا۔ اس سلسلے میں عاشق حسین بٹالوی یوں رقم طراز ہیں:

'' اقبال کو جب ہم نے گول میز کانفرنس میں بھیجا تو ہم یہ پیش پا افتادہ حقیقت نظر انداز کر گئے کہ اس قسم کی کانفرنس میں سازش، ریشہ دوانی، خوشامد اور منافقت کا دور دورہ ہوتا ہے۔ وہاں بلاوجہ ہنس ہنس کر باتیں کرنے اور بوقت ضرورت جھوٹ بول دینے سے بھی ذریع نہیں کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ اس ماحول میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا اور واپس آ گیا۔''

(عاشق حسین بٹالوی، اقبال کے آخری دو سال۔ لاہور سنگ میل پبلی کیشنز۔ ۲۰۰۰۔ ص۔ ۱۷)

اقبالؔ کی شاعری سب کے لیے ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں ہر کوئی اپنا عکس دیکھتا ہے۔ اقبالؔ نے بچوں کی نفسیات کے بارے میں بہت لکھا ہے۔ انہوں نے کئی نظمیں بچوں کی نفسیات کے بارے میں لکھی ہیں۔ جن کی عصری معنویت کے ضمن میں اقبالؔ کی نظم ''عہد طفلی'' بھی بامعنی اور وسعتِ فکر کو سمیٹے ہوئے ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے یہ نظم '' بانگ درا'' میں بچوں کی نظموں سے پہلے موجود ہے۔ پوری نظم میں ذہنی و قلبی واردات کی بازآفرینی کی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے زمین و آسمان میرے لیے ایک نئی جگہ تھے۔ جب میں بچپن کی رنگین کائنات میں محو تماشا تھا۔ اس وقت ماں کی گودی اک نیا جہاں تھا' ہر حرکت مجھے آرام کا باعث

بنتی ۔ علامہ نے اس نظم میں بچے کی زبانی کہلوایا کہ عہد طفلی میں جب کبھی میں روتا تو مجھے بہلانے کے لئے دروازے کی زنجیر کھٹکائی جاتی جس میں مجھے بڑا لطف آتا:

درد طفلی میں اگر کوئی رُلاتا تھا مجھے
شورش زنجیر در میں لطف آتا تھا مجھے

اقبال اپنی ایک نظم ''بچہ اور شمع میں کہتے ہیں:

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلک پروانہ خو!
شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تو

ooo

عموماً بچّے روشن چیز میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ موم بتی کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی بھی چیز کو پکڑتے ہی منہ میں ڈالنا بھی عام مشاہدے کی بات ہے اور یہ نفسیات بچوں میں رہے گی اور اس لیے ان اشعار میں بھی اقبالؔ کی عصری معنویت تلاش کی جاسکتی ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مغرب کا یہ ''تہذیبی مشن'' ابھی تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا اور پسماندہ اقوام آج تک اس کے مطلوبہ معیارِ زندگی تک نہیں پہنچ سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت، جمہوریت اور انصاف کے نام پر استحصال اور مروفریب ہی ملوکیت کی نفسیات ہے اور اقبالؔ نے اس سے خوب پہچانا ہے۔ خضر راہ'' کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلادیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

ooo

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

ooo

اقبالؔ کے ان اشعار کے حوالے سے مغرب کے ''تہذیبی مشن'' اور ''ملوکانہ نفسیات'' کو مدنظر رکھا جائے تو امریکی حکومت کے دعوے کہ اس کے اقدامات عدل و انصاف، جمہوری اقدار اور تہذیب کے تحفظ کی خاطر ہیں، سراسر فریب دکھائی دیتے ہیں۔ ظاہر ہے استعماری سیاست، ذاتی اقتصادی مفادات اور عالمگیریت کے روپ میں جدید ترین نوآبادیاتی نظام کے ذریعے دنیا کا ثقافتی اور معاشی استحصال تہذیبوں کی ترقی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے علامہؔ کی شاعری عصری معنویت کے لحاظ سے عمدہ ہے۔

شاعر مشرق علامہؔ کے عہد کے دکھ، اور عصر حاضر کے مسائل ایک شاعر کی نظر سے دیکھیں تو ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ مزاحمت چاہے مادی اور ارضی غلامی کے خلاف، دونوں میں شدت ہو تو نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ اقبالؔ کے ڈکشن اور انداز کو فیض احمد فیضؔ اور فیضؔ کے انداز ڈکشن کو فرازؔ نے آگے بڑھایا ہے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ حیات سوز شاعری، وقتی مقبولیت حاصل کر بھی لے، بالآخر بے اثر ہو کر مر جاتی ہے۔ ہاں اپنے ساتھ اپنے عہد کو بھی لے مرے تو دوسری بات ہے۔ اسی لیے ایک شاعر کو صرف اظہار پر توجہ مرکوز رکھنے کی بجائے، اظہار کے اثرات پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

☆☆☆

ڈاکٹر قطب سرشار
محبوب نگر

غالبؔ کی شاعری: حسی تجربوں کا تخلیقی ارتکاز

اُردو کے ممتاز نقاد پروفیسر شمیم حنفی اپنی تصنیف ''نئی شعری روایات'' میں استدلال کرتے ہیں کہ ''اقبال اک ارض خواب (یوٹوپیا) کے جویا تھے۔ اقبال عظمت آدم کے نغمہ خواں ہیں، ان کی شاعری میں فرد کی ہزیمتوں اور پسپائی کے مظاہر اس کے وجود کی حقیقت کا سراغ لگاتی ہے''۔

اقبال ارض خواب کے جویا نہیں تھے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو ان کی گم شدہ تصویر دکھائی ہے اور باشندگانِ ارض کو ایک صحت مند طرز حیات کے امکانات کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے، تاکہ فرد اور معاشرے کی شکست وریخت سے نسل انسانی کو نجات مل جائے۔ جبکہ غالب کا لہجہ شعر طنز آمیز تنقید کا مظہر ہے۔ ساتھ ہی معاشرے کے منفی اقدار سے انحراف کا بے باکانہ رویہ بھی انہوں نے کج روئ حیات کا مرثیہ رقم کیا ہے۔ وہ اپنے حسی و بصری تجربوں کے حوالوں سے استدلال کرتے ہیں۔

اسلوب غالب کے حوالے سے تمہید کے بعد احوال غالب کو موضوع گفتگو بناتے ہیں۔ غالب نے جہاں جہاں اشعار میں ''ہم'' اور ''میں'' کی تکرار کی ہے ان کے یہاں ''ہم'' اور ''میں'' کا مطلب تعارف ذات وکائنات، انفرادی واجتماعی کردار نگاری ہے جو کلام غالب پر محیط نظر آتی ہے۔ خود کلامی اردو شاعری خصوصاً غزل کا روایتی وصف رہا ہے:

اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث' مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

غالبؔ کا استدلال ہے کہ اگر اہل نظر کے حق میں حادثات کے طوفان کے مقابل مکتب فکر ہے تو جان لیں کہ اس طوفان کے تھپیڑے استاد کے تھپیڑوں سے کم نہیں ہوتے۔ لگتا ہے غالب اہل دانش کو طفل مکتب باور کرتے ہیں یا یہ گردانتے ہیں، ہر مکتب فکر سے وابستہ فرد علم کی لامتناہی کائنات کے مقابل کسی طفل مکتب سے زیادہ نہیں ہوتا۔

غالب اشعار کے آئینوں میں بظاہر کہیں گراں خاطر، کہیں جگر سوختہ اور کہیں جگر دار نظر آتے ہیں۔ وہ خوش نوا بھی اور آشفتہ نوا بھی۔ غالب عموماً کرب ناک حسی تجربوں کے مقابل اک جانباز مغل سپاہی کی طرح سخت جاں نظر آتے ہیں۔ تاہم انسان ہونے کے ناطے ٹوٹ کر بکھر جاتے بھی ہیں، پھر معاً خود کو سمیٹنا بھی جانتے ہیں۔ جب وہ بصری تجربوں کے دوران جاں کاہ منظر کا مشاہدہ کرتے ہیں، ان کے سینے سے بے ساختہ آہ سرد نکل جاتی ہے۔ اس صورتحال کی تخلیقی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں:

ہوں درد مند' جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ' گہ اشکِ چکیدہ ہوں

غالبؔ کہتے ہیں جبر و اختیار کے مرحلے میں میرا موقف دردمندانہ رہا ہے۔ کہیں میرے سینے سے ایک سرد آہ نکل جاتی ہے تو کہیں میرا وجود آنسوؤں کی تراوش کرنے لگتا ہے۔ اس شعر میں غم ذات، غم زمانہ کے ساتھ ساتھ چلتا دکھائی دیتا ہے۔ ایک اور شعر ہے جو اسی قبیل کا معنوی ذائقہ رکھتا ہے اس طرح ہے:

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بس کہ تلخیٔ غم ہجراں چشیدہ ہوں

غالب کہتے ہیں محرومیوں کی تلخیاں میرے وجود میں اس درجہ جذب ہوچکی ہیں کہ میں کسی طرح بھی شیریں مقال نہ ہوسکا۔ یہاں تک کہ میں نیم جاں ہوگیا ہوں۔ غالب کا یہ وہ حسی تجربہ ہے جس نے انہیں شکستہ و مایوس کررکھا ہے۔ اس شعر کی معنویت اگر غالب کی ذات سے منسوب کرکے دیکھتے ہیں تو غالب شکستہ کی تصویر ہی ابھر کر آتی ہے۔ ''میں'' کو اگر استعارہ باور کرلیں تو غم حیات کی گرفت میں انسان کی حسیات، یاسیت کی نفسیات کو فروغ دیتی ہیں۔ اس سبب سے انسان کے مستقبل میں دور تک احساس کمتری کی سیاہی سی پھیل جاتی ہے۔ کہیں کہیں غالب مذہبی نمائندوں کی محدود طرز فکر سے اختلاف بھی کرتے نظر آتے ہیں اور خود کو موحد بھی باور کرواتے ہوئے کہنے لگتے ہیں:

نہیں کہ مجھ کو قیامت پہ اعتقاد نہیں
شب فراق سے روز جزا زیادہ نہیں

اس شعر میں شب فراق سے مراد غالباً وہ لمحہ امید ہے جو انتہائی طوالت کے باعث عرصہ عذاب لگنے لگتا ہے۔ غالبؔ پھر پہلو بدل کر کہنے لگتے ہیں:

ملنا اگر تیرا نہیں آساں، تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
طاعت میں تار ہے نہ مئے انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے
کوئی دنیا میں اگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

محولہ اشعار متضاد حقائق کے ایسے معنوی تضادات ہیں جن کے باعث غالب کے ایقانات غیر یقینی کے شکار ہوگئے ہیں۔ جنت، فردوس، بہشت جیسی اصطلاحات مفروضات کی ترجمانی نہیں ہیں بلکہ قرآن مجید نے ان اصطلاحات کے وسیلے سے کرب و راحت کی سرد گرم محسوساتی دنیاؤں کی تعبیرات دی ہیں، جو اعمال خیر و شر کے ردعمل کے معنی دیگر ہیں۔ بقول قرآن:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (سورۃ البقرہ:286)
(جس نے جو کمایا اس کو اس کا صلہ بھی ویسا ہی ملے گا)

جنت اور دوزخ دل کو بہلانے کے لئے سبز باغ نہیں ہیں بلکہ خالق کائنات کے انکشافات حق ہیں۔ لگتا ہے غالب کی قرآن فہمی تسامح کا شکار ہوگئی ہے۔ غالب فن شعر گوئی کی کائنات کے شہنشاہ ضرور ہیں، غالب زبان و ادب کا دبستان ہے، امام سخنوراں ہے، غالب کا فکری ماخذ مکروہات حیات اور

زوال آمادہ قوموں کا مرثیہ ہے لیکن بقائے انسانیت کے لئے افکار غالب میں کہیں بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ بقائے انسانیت کی افہام وتفہیم کی راہ جو غالب نہ دکھا پائے، وہ اقبال نے بہ درجۂ کمال دکھائی ہے۔ افکار غالب میں رد وقبول کی ایک کشمکش پائی جاتی ہے جبکہ اقبال مردِ مومن کو سمندر کی طوفانی لہروں کی طرح ابھرتا ہوا اور فاتح زمانہ کی طرح دیکھتے ہیں:

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

غالب کے اشعار آگہی ذات وکائنات کا مظہر ہیں؛ جیسے:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیمانؑ مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

محولہ اشعار کے معنوی تناظر میں اشرف مخلوق کی ایک بلند قامت شبیہ ابھر آتی ہے جس سے قدر آدم کی توضیح ہوتی ہے۔ تاہم جبر واختیار کے مرحلے میں غالب کہیں کہیں عام انسان کی طرح ضعف جرأت کے سبب مجبور ومظلوم بھی نظر آتے ہیں:

نے سُبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے رابطہ
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

نہ ہی میں تسبیح ڈھال سکتا ہوں نہ ہی جام شراب کو ہاتھوں سے پکڑ پاتا ہوں، میری مثال ایسے فرد کی مانند ہے جس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہیں۔ اس شعر میں ایک حد درجہ بے بس اور مظلوم انسان کی شبیہ دیکھی جاسکتی ہے۔ آگے مزید خاکساری وخودداری بھی ملاحظہ کریں:

ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نہ دانۂ افتادہ ہوں نہ دام چیدہ ہوں

میری خاکساری پر گمان نہ کریں کہ میں زمین پر پڑا ایسا دانہ ہوں جسے شکاری نے شکار کو پھانسنے کے لئے زمین پر پھیلا رکھا ہے۔ تاہم میں کسی کا دست نگر نہیں ہوں۔ اہل زہد و ورع کی نظروں میں جچتا نہیں ہوں لیکن گنہگاروں کے درمیان میں یقیناً برگزیدہ ہوں۔ اس خیال کا ترجمان یہ شعر ہے:

اہل ورع کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقے میں؛ میں برگزیدہ ہوں

ہاں اتنا ضرور ہے کہ غالب کے زبان وبیان، لب و لہجہ اور زاویہ ہائے فکر آسان فہم نہ ہونے کے باعث خواص تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے۔ یہ غالب کے شعری اظہار کا عجز نہیں ہے بلکہ ضعف نافہمی ہوسکتی ہے، اس طرح شعر غالب اور فہم عوام کے مابین فاصلہ بن جاتا ہے:

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
میں ہوں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں

اخلاقی و معاشرتی اقدار گذشتہ صدی سے تاحال بتدریج اپنی شفاف معنویت کھونے لگی ہیں۔ سماج کا ہر فرد دوسرے فرد کے مقابل اپنے اپنے مفادات کی خاطر نبرد آزما ہوگیا ہے۔ امروز کی درندگی لمحہ فردا تک پھیلنے لگی ہے۔ انسان اپنے ہم جنس سے خوف زدہ ہوگیا ہے۔ دہشت زدگی نے حساس انسانوں کو نفسیاتی مریض بنادیا ہے۔ زمانہ غالبؔ یہ صورت حال

ہمیں اپنی صدی جیسی لگتی ہے جبکہ وہ انیسویں صدی تھی۔ غالب دہشت زدہ نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اس شعر میں دہشت زدگی اور مردم بیزاری جس قدر شدت سے پائی جاتی ہے اتنی ہی شدت کے ساتھ ان کے دورِن ذات کی توانائی بھی ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو پیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

(دیوان غالب:93)

دل و دماغ اگر مرعوبیت اور غلامی کے شکار نہ ہوں، ان پر غلبہ حزن و ملال نہیں ہوسکتا وہ اپنے غم کدہ کی شمع کو برق سے روشن کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ حریت افکار اور حریت ضمیر کے حامل وجود پر جب غموں کی دھند چھا جاتی ہے تو وہ برق آسا حوصلوں سے ماتم خانہ کی شمع کو بہ ہر حال روشن رکھتے ہیں۔ مزاج میں جب حسرتوں اور محرومیوں سے محظوظ ہونے کی رغبت پائی جاتی ہو تو تلخی حسرت اور احساسِ شکست آرزو اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ کھلا کہ ناکامیوں کی خاکستر سے آگہی کی چنگاریاں ابھر آتی ہیں:

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کہوں
آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

اردو غزل گوئی کے باب میں حجابات استعارہ ایک ناگزیر موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ حجابات استعارہ یعنی استعاروں کے پردوں میں کسی فرد یا شئے یا عمل کو چھپا کر پیش کرنے کا فن کمال تخلیقیت ہوتا ہے۔ شعر غالب اس طرح کے کمال عرض ہنر کی توانائی بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ استعارہ خالص سریت سے معمور ہوتا ہے، حس کی گرہ کشائی بظاہر ذہنی مشقت معلوم ہوتی ہے لیکن اسرار کی کھوج میں ذہنی تلذذ بھی مضمر ہوتا ہے۔ شاید کہیں کہیں غالب استعارہ کو ابہام بھی باور کرتے ہیں اور اپنی ابہام نگاری پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں، کہتے ہیں:

میرے ابہام پر ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال پہ کرتی ہے تراوش تفصیل
فکر مری گہر اندوز اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموز عباراتِ قلیل

محولہ اشعار سے اجاگر ہونے والے دعویٰ کی دلیل حسب ذیل اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے:

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پر وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد آیا

وحشت کی کیفیت کا ذائقہ دشت اور گھر دونوں جگہوں پر یکساں محسوس ہوتا ہے، تاہم دشت کی وحشت گھر سے زیادہ ہے اور تشفی بخش بھی۔ اس شعر میں گھر یعنی درونِ خانہ کے مسائل ہیں۔ اور دشت بیرون خانہ یعنی معاشرتی مسائل۔ دونوں کی معنویت میں یکسانیت کے باوجود معاشرتی مسائل میں وحشت عنصر بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ گویا غالب کا حوصلہ مشکلات سے نبرد آزما رہنے میں لذت محسوس کرتا ہے:

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

(دیوان غالب:106)

ایسا جادو جو سفینے کو سراب میں چلا تو دیتا ہے لیکن مدعا طلبی میں بے فیض ثابت ہوتا ہے۔ شعر میں بحر، سحر، سفینہ اور سراب جیسے اجنبی الفاظ نہ سہی اجنبی معنویت کے حامل ضرور ہیں۔

زندگی اور سراب۔ فریب حیات کے استعاروں اور علامتوں کی ایک بازی گہہ حرف و ہنر ہے جو شعری اظہار کو لذت اسرار سے آشنا کرتی ہے۔ استعاروں سے آراستہ چند اور مضامین سے معمور یہ بھی ہیں:

بہ قدر حسرتِ دل چاہیے ذوق معاصی بھی
بھروں ایک گوشہ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

کہتے ہیں حسرت دل کے بہ قدر ذوقِ معاصی مناسب ہوتا ہے لیکن میرا دامن تمنا نہایت بے کراں ہے کہ سات دریاؤں کا پانی میرے دامن کے صرف ایک گوشہ میں سما جاتا ہے۔ اس مضمون شعر پر غلو کا شائبہ ہوسکتا ہے، جبکہ غالب نے انسانی ہوس کی وسعتوں کا اندازہ کروایا ہے۔ ایک گوشۂ دامن میں ہفت دریا کا سما جانا:

اسدؔ کی طرح سے میری بغیر از صبح رخساراں
ہوئی شام جوانی اے دل حسرت نصیب آخر

اس شعر کا موضوع محرومیوں کی کثرت ہے۔ کہتے ہیں اسد کی طرح میری بھی جوانی کی شام ہوگئی لیکن مجھے حسن رخساراں کی صبح نصیب نہ ہوسکی ہے۔ رخساروں کی صبح، جوانی کی شام اور ماحصل حسرت نصیبی جیسے استعاروں کے پردے سے زندگی کے رائیگاں لمحات کی تصویریں ابھر آتی ہیں۔ انسان سدا آرزوؤں کے تعاقب میں دوڑے جاتا ہے اور تمنائیں اسے قعر مذلت میں ڈھکیل دیتی ہیں۔ باوجود اس کے انسان لذت معاصی کے نشے سے باز نہیں آتا۔ ایک جذبہ ایسا جو دورنِ ذات میں چنگاریاں بھر دیتا ہے، ساتھ ہی محرک ہوتا ہے فتنہ طرازیوں کا ہے۔ غالب کہتے ہیں یہ حسد، تنگ نظری کا ردعمل ہے، فتنہ طرازی کا محرک ہوجاتا ہے:

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

غالب حاسد کو ایک حکیمانہ سجھاؤ دیتے ہیں کہ اگر حسد کے باعث دل افسردہ ہوجاتا ہے تو حاسد کو چاہیے کہ وہ محسود کی کامرانیوں کا متواتر نظارہ کرتا رہے، مبادا کثرتِ نظارہ کے باعث حاسد کی تنگ نظر آنکھ کھل جائے۔ صبر اور انتظار آمیز تماشہ بینی حسد کی آگ کو آگہی میں بدل سکتی ہے۔

کلام غالب کے تمام تر اشعار کمالِ حرف و ہنر، اجنبی و نادر اصطلاحات مضامین خوش اعتبار کا ایک دلچسپ اور تحیر خیز ارتکاز ہے۔ زاویہ ہائے اظہار اس قدر مشکل کہ قاری کے ذوق تحقیق کو مہمیز کرتا ہے۔ غالب نے اردو دنیا میں نادر اظہار بیان، بے شمار لفظیات کا اک دفتر کھول نہیں رکھا بلکہ مکتب کھول رکھا ہے اور ہم طفل مکتب گذشتہ ایک صدی سے اکتساب غالب کیے جارہے ہیں، تاکہ اعتبار تخلیقیت اور بقائے زبان و ادب کے امکانات یقینی ہوتے رہیں۔ غالب کو قلق اس بات کا ہے کہ بیشتر شعراء میں حرف و ہنر کا عجز اور تخلیقیت کا فقدان پایا جاتا ہے۔ اس خیال کی ترجمانی یہ شعر کرتا ہے:

نہ انشا معنی مضموں، نہ املا صورتِ موزوں
عنایت نامہائے اہلِ دنیا ہر زہ عنواں ہیں

☆☆☆

ڈاکٹر ضامن علی حسرتؔ
مکان نمبر 9-16-60
احمد پورہ کالونی، نظام آباد

تحریک آزادی میں اُردو شعراء کا کردار

انگریز قوم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اُس نے آدھی سے زیادہ دنیا کو اپنا غلام بنا کر اُن پر حکومت کی ہے۔ اُن ممالک میں ہندوستان بھی شامل ہے۔ کبھی ہمارا یہ ملک انگریزوں کا غلام ہوا کرتا تھا اور ہم غلامی کی فضاء میں سانس لینے پر مجبور تھے۔ دنیا کی کسی بھی غیرت مند قوم غلامی کی زندگی کو قطعی برداشت نہیں کرتی۔ آزادی ہر ملک کا بنیادی حق ہے۔ کوئی بڑی طاقت اپنی طاقت کے زور پر کسی ملک کا اپنا غلام تو بنا سکتی ہے لیکن اُس ملک کی عوام کی آزادی کے جذبہ کو زیادہ دیر تک دبا کر نہیں رکھ سکتی۔ جس دن عوام کا سویا ہوا شعور جاگ اُٹھتا ہے تب اُن کی آزادی کی جدوجہد جنون کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور جب آزادی کا یہ جنون سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے تو حکمرانوں کے پیروں تلے زمین کھسکنے لگتی ہے اور اُنہیں اُس ملک سے بھاگنا ہی پڑتا ہے جس کو انہوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ ہم ہندوستانیوں نے بھی انگریزوں سے لڑ کر اپنے ملک کو آزاد کروایا ہے۔ جنگِ آزادی کی اس تحریک میں ہندوستان کے سبھی مذہبوں کو ماننے والے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائیوں نے آپس میں متحد ہو کر آزادی کی یہ جنگ لڑی تھی۔ اور سبھی کی زبان پر اُس وقت یہی شعر تھا:۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازو قاتل میں ہے

آزی کی تحریک میں ہمارے علماء بھی شانہ بہ شانہ آزادی کے متوالوں کے ساتھ تھے۔ اور اپنے وطن کی آزادی کی اس جنگ میں ہمارے سینکڑوں علماء شہید ہو گئے۔ علماء، مجاہدین کے ساتھ ساتھ اُردو کے سینکڑوں شعراء نے بھی اِس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اپنی شاعری کے ذریعہ اِن شعراء نے قوم کے اندر آزادی کی جوت کو جلائے رکھا۔ جس کے عوض انہیں جیل کی صعوبتیں، تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ اُردو کے اِن جیالے حوصلہ مند شعراء نے اِن کی تکالیف کی پرواہ کئے بغیر اپنے آزادی کے مشن کو برقرار رکھا۔ اور جیل کی چہار دیواری کے اندر بھی اپنی شاعری کی مشق کو جاری رکھا، حسرتؔ موہانی جنہوں نے آزادی کے متوالوں کو سب سے پہلے انقلاب کا نعرہ دیا تھا' انہیں بھی تحریک آزادی کے دوران جیل جانا پڑا، انہوں نے جیل کے اندر یہ خوبصورت شعر کہا:

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

اُردو کے بہت سارے شعراء ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں بُری طرح پھنس گئے تھے' اس کے باوجود اُنہوں

نے اپنا حوصلہ نہیں ہارا اور عملی طور پر اُنہوں نے اس جنگ آزادی میں اپنا بھرپور رول ادا کیا۔ بغاوت سے پہلے ہی اُردو شاعری میں انگریز دُشمنی کے حالات کا اثر بڑھنے لگا، اور اس بغاوت کا سب سے زیادہ زور دہلی میں دیکھنے کو ملا۔ چونکہ دہلی میں اُس وقت شعروشاعری کی محفلیں سرد پڑ چکی تھیں، ہر طرف سیاسی اور معاشی بحرانی کی کیفیت تھی۔ اس معاشی و سیاسی ابتری کے حالات میں بھی محمد شاہ رنگیلے نے شعروسخن کا پرچم تھامے رکھا اور بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک دہلی میں بیسیوں باکمال شاعر جمع ہوگئے تھے۔ اِن میں امام بخش صہبائی، ابراہم ذوقؔ، صدرالدین آزادؔ، مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، حکیم آغا جان بخش جیسے کہنہ مشق واُستاد شاعر موجود تھے جو تحریک آزادی میں اپنے فن کی خوشبو کو پھیلائے ہوئے تھے۔ دوسری جانب آزادؔ، حالی، داغؔ، بخش صابرؔ شہاب الدین ثاقب، سالک، مجروح مرزا نوؔر، باقر علی کامل وغیرہ جیسے نوعمر شعراء بھی تحریک آزادی میں اپنا کردار نبھانے کے لئے تیار تھے۔ بقول صاحب گل رعناؔ کے ''جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو فلک کو بھی زمین پر رشک ہونے لگتا ہے کہ اردو کے ایسے باکمال و باصلاحیت شعراء سب ایک جگہ جمع ہیں اور سبھی کا ایک ہی مقصد تھا کہ آزادی کی جنگ میں کس طرح سے اپنے فن کا کمال دکھایا جائے اور اپنے وطن عزیز کو اِن انگریزوں کی غلامی سے کیسے آزاد کروایا جائے۔ تحریک آزادی کے وقت اُردو کے انقلابی شاعر صہبائی کوچہ چیلان میں رہتے تھے۔ انگریزوں نے کوچہ چیلان پر حملہ کر دیا اور صہبائی اس حملے کی زد میں آگئے۔ کئی بے گناہ معصوم لوگ قتل کر دیئے گئے۔ صہبائی بھی قتل کر دیئے گئے۔ ان کے ساتھ ان کے بیٹے عبدالکریم سوزؔ (جو اردو کے بہت اچھے شاعر تھے) بھی ہلاک کر دیئے گئے۔ اس قتل عام میں صہبائی کے کنبہ کے جملہ چار افراد قتل ہوئے۔ صہبائی کے ہمعصر شاعر آزادؔ اس واقعہ پر بے حد رنجور تھے۔ اُنہوں نے اپنے غم کا اظہار اپنے شعر میں کچھ اس طرح سے کیا ہے:

کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

تحریک آزادی میں اُردو شعراء کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی جنہوں نے اپنے وطن کی بربادی سے متعلق اپنے شدید غم کا اظہار اپنی غزلوں کے ذریعہ نہایت ہی موثر ڈھنگ سے کیا ہے۔ ان شعراء میں شہاب الدین ثاقبؔ، داغ، مرزا حسین علی خاں، قربان علی بیگ سالکؔ، مصطفیٰ خاں شیفتہ، قادر بخت صابر، ظہیر الدین ظہیر، باقر علی خاں کامل اور میر مہدی مجروح کے نام شامل ہیں۔ یہ سارے ہی شعراء اپنے کلام کے ذریعہ ملک کی عوام کو آزادی کا پیام دیتے ہوئے اُن سے درد مندانہ اپیل کر رہے تھے کہ وہ آزادی کی شمع کو اپنے دل میں جلائے رکھیں اور تب تلک چین سے نہ بیٹھیں جب تک ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد نہیں ہو جاتا۔ اُردو شاعروں میں مومنؔ اس آزادی کی تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ مومنؔ شاہ اسمٰعیل شہید کے ہم سبق اور مولوی سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ ان بزرگوں کے خیالات کا اثر مومنؔ پر اس قدر ہوا کہ بقول خواجہ احمد فاروقی ''مومنؔ غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کو اصل ایمان اور اپنی جان کو ملک کی آزادی کے راہ میں قربان

کر دینے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے تھے۔تحریک آزادی کے دوران لکھی گئی مومنؔ کی ایک مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ کریں جو مومنؔ نے آزادی کے جذبہ سے سرشار ہو کر لکھے ہیں:

اب وقت ہے یہ جو ہمت کرو
حیات ابد ہے جو اس دم مرو
سعادت ہے جو جانفشانی کرے
یہاں اور وہاں کامرانی کرے
الٰہی مجھے بھی ہو شہادت نصیب
یہ افضل ہے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں تیرہ کار
پر تیرے کرم کا ہوں امیدوار
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں
مری جاں فدا ہو تیری راہ میں
میں گنج شہیدوں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

تحریک آزادی میں تقریباً سبھی شعراء نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔تحریک آزادی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً 375 اہم شعراء نے آزادی کے لئے اپنا تن، من دھن سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ان میں سے کچھ ایسے شعراء بھی تھے جو ان واقعات کے آسودۂ حال تماشائی نہیں رہے بلکہ اس دریا خوں کے شناور بن گئے۔انہوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور انگریزوں کے خلاف بہترین غزلیں اور نظمیں لکھیں۔بے شمار شعراء نے بڑی بڑی قربانیاں دیں، مصیبتیں جھیلیں اور قید و بند کی سخت و کڑی اذیتیں برداشت کیں۔ایسے مشکل حالات میں بھی نہ اِن کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آتی تھیں اور نہ ہی منہ سے کوئی آہ نکلتی تھی، بلکہ اُسوقت کے مورخین لکھتے ہیں کہ ان بہادر جیالے شاعروں کے ہونٹوں پہ ایک تبسم ہوا کرتا تھا اور اُن کی آنکھوں میں اُمید کی کرن نظر آتی تھی۔

۱۸۵۷ء کے واقعات کی طرف اُردو شاعروں کا ردِّعمل مختلف متنوع طریقوں سے ہوا۔غدر کے واقعات کو غالبؔ نے بھی بُرے ناموں اور ایک ڈراؤنے خواب سے تعبیر کیا ہے۔اس ہنگامے سے اِن کے مشاغل کا نقشہ بگڑ گیا تھا لیکن اس بات کا یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ غالبؔ کا دل حب الوطنی کے جذبے سے عاری تھا یا انہیں اپنے ہم وطنوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔غدر کے بعد انگریزوں نے اُردو شعراء پر مظالم کے جو پہاڑ توڑے تھے، غالبؔ کو اس بات کا احساس تھا۔اپنے طبقے کی پامالی اور شہر کی ویرانی کا جو تذکرہ غالبؔ کے ہاں ملتا ہے وہ بڑا ہی دردناک ہے۔دلی پر انگریزوں کے غلبے کے بعد کس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ سکتا۔لیکن مرزا غالبؔ کے خطوط میں انگریزوں کی زیادتیوں اور سختیوں کی طرف زبردست اشارے ملتے ہیں۔غالبؔ بھی ایک الگ انداز میں تحریک آزادی سے جُڑے ہوئے تھے۔غالبؔ نے اپنی آنکھوں سے انگریزوں کا ظلم اور اپنے ساتھیوں کی مظلومیت و بے کسی دیکھی تھی۔اپنے اس احساس کو اپنے اِس جذبہ کو اُنہوں نے اپنے اشعار میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے:۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آپ انسان کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ
سوزش داغ ہائے پنہاں
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

غالبؔ کی طرح شیفتہؔ بھی انگریزوں کے ظلم وستم سے سخت نالاں تھے۔قلم کے سپاہی تھے۔اس لئے اپنے دل کی بھڑاس اپنے اشعار میں نکالتے تھے۔شیفتہؔ کی بھی جاگیر ضبط ہوگئی تھی۔ابتدائی عدالت نے 7 ربرس کی سزا سنائی تھی۔بعد میں کسی طرح سے بری ہوگئے۔اپنی تکلیفوں اور پریشانیوں کا تذکرہ شیفتہؔ نے اپنے اشعار میں کچھ اس طرح سے کیا ہے:

ہائے دہلی و زہے شدگانِ دہلی
آپ جنت میں ہیں اور دل نگرانِ دہلی
وہی جلوہ نظر آتا ہے تصور میں ہمیں
مٹ گئے پھر بھی باقی ہے نشانِ دہلی
گر نہ کہوں کہ یہ دلی ہے تو ہرگز نہ پڑے
دلی والوں کو بھی دلی پہ گمانِ دہلی

تحریک آزادی کے حالات سے ایسا کونسا شاعر تھا جو متاثر نہ تھا۔اس زمانے کے حالات سے متاثر ہوکر داغؔ نے جو شہر آشوب لکھا تھا ''فغانِ دہلی'' میں درج ہے۔داغؔ نے جنگ و جدال کا تذکرہ اور دل کی بربادی کے حالات کو اپنے اشعار میں کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے:

یہ شہر وہ ہے کہ انس و جان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدردان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا
رہی نہ آدھی یہاں سنگ وخشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت
فلک نہ قہر وغضب تاک تاک کر ڈالا
تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں
مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

تحریک آزادی کے دور کا ہر شاعر آزادی کی اس تحریک میں حصّہ لینا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا۔ہر شاعر کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اِس تحریک کا حصّہ بنے اور اپنے حصے کا رول ادا کرے۔ہم نے پڑھا ہے اور دیکھا ہے کہ لوگ جب تحریکوں سے جُڑتے ہیں تو بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور خود کو سب سے بڑا حُب الوطن بتلانے کی کوشش کرتے ہیں،اور جب تحریک میں قربانی دینے اور خود کو وقف کرنے کا وقت آتا ہے تو میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں یا پھر شتر مرغ کی طرح اپنا سر ریت میں چھپا کر تحریک کے ختم ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔شاید اِسی بزدلی اور بھگوڑے پن کی وجہ سے اکثر بڑی بڑی بامقصد اور اہم تحریکیں وقت سے پہلے ہی دم توڑ دیتی

ہیں۔لیکن آزادی کی تحریک ایک ایسی تحریک کے طور پر یاد رکھی جائے گی جس میں سبھی شعبوں سے تعلق رکھنے والوں نے اپنا سب کچھ قربان کرتے ہوئے اپنے وطن کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کروایا۔ایسی تحریک میں سینکڑوں اُردو کے شعراء نے اپنا سب کچھ گنوادیا، جائیداد، جان، مال یہاں تک کہ اپنے نام و نمود کو بھی آزادی کے تحریک کی چوکھٹ پر قربان کردیا۔تحریک آزادی کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس تحریک کے واقعات میں اُردو شاعروں کا جو کردار رہا اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس ہنگامہ کے بعض سرگروہ مثلاً بہادر شاہ ظفرؔ، مرزا سلطان، مرزا برجس قدرؔ اور نوابؔ دہلوی، دہلی کے ان چند نوابوں اور راجاؤں میں سے تھے جنھوں نے غدر کے زمانے میں انگریزوں کے خلاف نہایت بہادری اور پامردی سے لڑائیاں لڑیں۔انگریزوں کے غلبہ کے بعد یہ سب گرفتار ہوئے اور ان میں سے کچھ کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔مرزا خضر سلطان بہادر شاہ ظفر کے سب سے چھوٹے شہزادے تھے۔وہ شاعر بھی تھے اور غالبؔ سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔میجر ہڈسن نے مرزا سلطان کو اپنی گولی کا نشانہ بناتے ہوئے اُنہیں موت کی نیند سلادیا، بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی مرزا خضر سلطان کی لاش کو چاندنی چوک کوتوالی کے سامنے پھانسی کے تختے پر ایک رات اور ایک دن سرِ بازار لٹکا کر رکھا۔انگریز اپنی اس گھناؤنی حرکت سے دیگر باغیوں کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ غدر کی اِس جنگ میں باغیوں وانقلابیوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا۔اس زمانے میں اُردو کے بہت سے شعراء نے جوش اور ولولوں سے بھرے ہوئے جنگی اشعار کہے ہیں جو بطور نعرہ بھی استعمال ہوتے تھے۔چند اشعار ملاحظہ کریں:

لبالب پیالہ بھرا خون سے
فرنگی کو مارا بڑی دھوم سے
دمدمے میں دم نہیں خیر مانگو جان کی
اے ظفر ٹھنڈی ہوئی شمشیر ہندوستان کی
نمازیوں میں بُو رہے گی جب تلک ایمان کی
تب تو لندن تک چلے گی تیغ ہندوستان کی

بے شمار اُردو شعراء تحریک آزادی سے جُڑے اور اُن کا نام تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگیا۔ تحریک آزادی کی اِس مہم میں حصہ لینے والے شعراء میں دو خاص نام کامریڈ مخدوم محی الدین اور فیض احمد فیض کے بھی ہیں۔ فیضؔ اور مخدوم بھی انگریزی بربریت اور ظلم سے شدید ناراض تھے۔دونوں نے تحریک آزادی سے متعلق دو خوبصورت اور اثر انگیز نظمیں لکھی تھیں۔مخدومؔ کی نظم ''چاند تاروں کا بن'' اور فیض احمد فیضؔ کی نظم ''صبح آزادی'' نے اُسوقت کے آزادی کے پروانوں میں ایک جوش اور ولولہ بھر دیا تھا۔دونوں کی نظموں میں آزادی کے متوالوں کو یہ پیغام دیا گیا کہ وہ آزادی کی یہ جنگ اُسوقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ آزادی نہیں مل جاتی۔اِس موقع پر فیضؔ اور مخدومؔ کی نظموں کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔ فیض کی نظم ''صبح آزادی'' کے اشعار ملاحظہ کریں:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں، جس کی آرزو لے کر

چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا موج کا ساحل
جواں لہو کی پُر اسرار شاہراہوں پر
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کے بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں بانہیں بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریب تھا حسینانِ نور کا دامن
سُبک سُبک تھی تمنا دبی دبی تھکن

مخدومؔ آزادی کے متوالوں سے اپنی نظم ''چاند تاروں کا بن'' میں کچھ اِس طرح سے مخاطب ہیں' ملاحظہ کریں:

موسم کی طرح جلتے رہے' ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن تشنگی تھی مگر
تشنگی میں سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لئے منتظر مردوزن
مستیاں ختم' مدہوشیاں ختم' ختم تھا بانکپن

اسی نظم کا ایک اور بند ملاحظہ کریں کہ مخدوم تحریک آزادی کے پرواوں سے کیا کہنا چاہتے ہیں:

رات کی چھٹیں ہیں اندھیرا ابھی ہے
صبح کا کچھ اُجالا' اُجالا بھی ہے ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو سوئے منزل چلو
منزلیں دادکی کُوئے دل دادکی منزلیں
دوش پر اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

یہ خوبصورت بامعنی و بامقصدی نظمیں جو اپنی وطن کی آزادی کے لئے اپنے خونِ دل سے لکھی گئی ہیں۔ اِن نظموں نے فیض احمد فیضؔ اور مخدومؔ محی الدین کا نام آزادی کے جذبے سے سرشار اُن شعراء کی فہرست میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا جنہوں نے تحریک آزادی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ ''تحریک آزادی میں اُردو شعراء کا کردار'' یہ ایسا موضوع ہے جسے چند صفحات میں سمیٹنا مشکل ہے۔ اس وسیع اور اہم موضوع کے لئے بے شمار صفحات درکار ہیں۔ میں نے اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ تحریک آزادی سے جُڑے ہوئے سینکڑوں شعراء میں سے چند اہم شعراء کا تذکرہ کرسکوں۔ آخر میں بہادر شاہ ظفرؔ کے چند اشعار پر اپنے اس مقالے کا اختتام کرنا چاہوں گا۔ میرے خیال میں تحریک آزادی میں سب سے زیادہ نقصان بہادر شاہ ظفرؔ (جو سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار تھے) کا ہوا ہے۔ اپنے وقت کے ایک شاہ کے لئے اِس سے بڑا المیہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ اُسے اپنے ہی وطن میں دوگز زمین دفن ہونے کے لئے نہ مل سکی۔ اپنی اِس تکلیف کا اپنے اس درد کا تذکرہ بہادر شاہ ظفرؔ نے اپنے اِن اشعار میں کچھ اس طرح کیا ہے:

نہ دبایا زیر زمیں انہیں' نہ دیا کسی نے کفن انہیں
نہ ہوا نصیب انہیں 'نہ کہیں نشانِ مزار ہے
کوئی کیوں کسی کا لُبھائے دل' کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل' وہ دکان اپنی بڑھا گئے

☆☆☆

ڈاکٹر معین افروز
حیدرآباد

جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں تصوّف کی روشنی

انسان ایک دوسرے انسان کا آئینہ ہوتا ہے اور بغیر آئینہ دیکھے کوئی گھر سے نہیں نکلتا۔ نہ صبح ہوتی ہے نہ شام، آئینہ جب تک اس کے روبرو نہ ہو اُسے اپنے ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ جب آئینہ سامنے آجاتا ہے تو وہ خود کو سنوارنے لگتا ہے۔ بغیر اس عمل کے وہ رہ نہیں پاتا اور آئینہ نہ جانے ہر روز کتنے چہرے دیکھتا رہتا ہے جو اس کے سامنے آتے ہیں اور سنور کر چلے جاتے ہیں اور نہ جانے انسان ہر روز ایسے کتنے آئینوں کا منھ دیکھ کر خود کو نکھارتا سنوارتا رہتا ہے لیکن کسی کا عکس آئینے میں قید نہیں ہوتا۔ لیکن آج ایک ایسا عکس مجھے آئینے میں قید نظر آرہا ہے جسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ تقریباً ایک مکمل صدی اس میں رہ چکا ہے۔ میں نے اس عکس کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے ایک صدی صاف صاف نظر آنے لگی۔ میں نے پوچھا کون ہو اور اس آئینے میں کیسے قید ہوگئے۔ جواب آیا کہ میں خیال ہوں جو فن کی اساس بن کر لفظوں کے آئینوں میں ہمیشہ رہتا ہے۔ خیال کی کوئی حد نہیں ہوتی، اس کو کوئی قید نہیں کرسکتا، وہ آسمان میں اُڑتے ہوئے پنچھی کی طرح ہوتا ہے۔ اسی لئے میں قید نہیں ہوں' آزاد ہوں۔۔۔ جگن ناتھ آزاد۔

جگن ناتھ آزاد کی اس آزاد خیال کہکشاں میں' میں نے ایک نہایت سنہری روشنی دیکھی جو میری آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر اُتر جاتی ہے۔ وہ تصوف کی روشنی تھی۔ انسان میں مقناطیسی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی پسندیدہ چیزوں کو کھینچتا رہتا ہے۔ اچھی یا بُری یہ فطرت پر منحصر ہوتا ہے۔ مجھے جگن ناتھ آزاد کی شاعری میں موجود اسی روشنی نے ان پر قلم اُٹھانے کا حوصلہ بخشا۔ جگن ناتھ آزاد کی پیدائش ۵/دسمبر ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ آزاد پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی تھے۔ بہترین نثر نگار ہونے کے علاوہ ماہر اقبالیات بھی کہلاتے تھے۔ انہوں نے اقبال کا گہرائی و گیرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جس کی وجہ سے ان کی سوچ اور فکر پر اقبال کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ آزاد ۷۰ کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے سفرنامے بھی اس انداز سے لکھے کہ پڑھنے والے کو یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ اس سفر پر ان کے ہمراہ موجود ہے۔ ان کو پڑھنے کے بعد یہ احساس جاگتا ہے کہ قاری دنیا سے کہیں دور نکل پڑا ہے۔ رات کی مدمست ہواؤں میں چاندنی کا رقص نظر آنے لگتا ہے۔ جھیل کی آغوش میں

چاند کے سمٹنے کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لگتا ہے الفاظ جگنوؤں کی طرح رات کے سنّاٹے میں قافلوں کو منزلوں تک پہنچا رہے ہیں۔ آزاد، اقبال میموریل ٹرسٹ کے صدر ہونے کے علاوہ انجمنِ ترقی ہند کے بھی صدر رہ چکے۔ انہیں بہت زیادہ لکھنے کا شوق تھا، وفات سے پندرہ روز قبل تک لکھتے رہے، اور ۲۴ رجولائی ۲۰۰۴ء کو وفات پائے:

عقلِ بیتاب اسی خاک میں ہے محوِ سکوں
عشق کا جذبِ تگ و تاز اسی خاک میں ہے
جس کے نغموں کی حرارت ہے ابھی تک دل میں
محفلِ ہند کا وہ ساز اسی خاک میں ہے

جگن ناتھ آزاد نے حمد، نعت، غزلیں، نظمیں، قطعات، رباعیات سبھی اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں شاعری میں تصوّف کا ایک خاص عنصر پایا جاتا ہے جو بڑا خاص مقام رکھتا ہے۔ میں نے ان کے یہ حمدیہ شعر تقریباً آج سے ۱۰ سال پہلے پڑھے تھے، میں اُسی پہل سے ان کا کلام پسند کرنے لگا:

مٹی کو یہ تنویر شرر کس نے عطا کی
تجھ کو یہ چمک موج گہر کس نے عطا کی
ادراک کو وابستہ کیا کس نے جنوں سے
ظلمت کو یہ تنویرِ سحر کس نے عطا کی
پتھر میں بھی تابندہ شرر دیکھ رہا ہوں
پتھر کو شرر مجھ کو نظر کس نے عطا کی
خاشاک ہے ساحل پہ گہر بطنِ صدف میں
آزاد یہ موجوں کو نظر کس نے عطا کی

میرے نزدیک آزاد اپنی شخصیت کا مکمل آئینہ ہیں۔ آزاد نے دنیا کو محبت کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایسی آنکھیں جن میں کبھی نفرت نہیں ہوتی۔ ایسی آنکھیں جن کے پانی میں کشتیاں چلتی ہیں اور ان کشتیوں میں موم کے مسافر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچتے ہیں۔ کسی میں کوئی بدلے کی بھاونا نہیں، پانی آگ کی کشتیوں کو نہیں بجھاتا اور آگ موم کے مسافروں کو نہیں پگھلاتی۔ وہ آنکھیں جو صرف حقیقتوں پر نظر رکھتی ہوں تعینات پر نہیں۔ بقول اقبالؒ:

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
میری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

یہی سوچ اور فکر آزاد کے یہاں ملتی ہے۔ یقیناً آزاد، اقبال سے بیحد متاثر تھے لیکن اس کے باوجود ان کا اپنا الگ اُسلوب اور الگ آہنگ ہے۔ یہی شاعر کی اپنی پہچان ہوتی ہے کہ وہ لہجوں کی بھیڑ میں اپنا راستہ الگ نکال لیتا ہو۔ امیر خسرؔو سے لے کر علامہ اقبالؔ تک حافظؔ شیرازی سے لے کر امجدؔ حیدر آبادی تک جو تصوّف ان کے اشعار میں پایا جاتا ہے وہ ان کے خیالات کی اڑانوں کا اندازہ لگانے کے لئے بہت ہے۔ اسی طرح جب ہم آزاد کی شاعری پڑھتے ہیں تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہی عناصر ان کی شاعری میں بھی پائے جاتے ہیں:

تڑپ کہیں ہو چکی تھی پیدا ظہورِ بزم جہاں سے پہلے
کہ اپنے جلوؤں میں خود گھرا تھا نمودِ مکاں سے پہلے
ضیائے شمس و قمر سے پہلے تجلّیِ کہکشاں سے پہلے
دل اپنے جلوے لٹا رہا تھا فروغِ بزمِ جہاں سے پہلے

جہانِ ناآفریدہ میرے خیال میں جگمگا رہا تھا
میں خود اشارہ بنا ہوا تھا اشارۂ کُن فکاں سے پہلے
ادھر میں وابستہ ازل ہوں اُدھر ابد سے مرا تعلق
مرا فسانہ تھا ہر زباں پر فسانۂ دوجہاں سے پہلے
جو بےخودی کی یہی ہے صورت جو سرخوشی کا یہی ہے عالم
تو رازِ دل کا نہ فاش کردوں کہیں میں خود رازداں سے پہلے

ooo

یہ جدّت طرازی، یہ فکری اڑان، یہ گہرائی و گیرائی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان کے سوچنے کا طریقے کار کیا تھا۔ دنیا میں ہر شخص اپنی فطری کیفیت کو چھپا سکتا ہے مگر ایک شاعر نہیں چھپا سکتا۔ وہ کہیں نہ کہیں خود کو ظاہر کر ہی دیتا ہے۔ اس کی شاعری ہی اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ اسی لئے اگر کسی شاعر کو جاننا ہو تو اس کے کلام کا مطالعہ کر لینا چاہئیے۔ کیونکہ چہرے جھوٹ بولتے ہیں پر آنکھیں نہیں۔ اور شاعری شاعر کی آنکھوں کا درپن ہوتی ہے۔ وہ شعر نہیں کہتا بلکہ اپنی خودنوشت سوانح لکھتا رہتا ہے۔ جیسا کہ آزاد کے کلام میں جگہ جگہ ان کے تصوّفانہ خیالات کا اظہار ہو جاتا ہے:

دراصل میری خلوتِ دل میں مکیں ہو تم
یہ اور بات کہ بظاہر کہیں ہو تم

ooo

دیر و حرم بھی، دیدۂ نم بھی، گلشن بھی، ویرانے بھی
دل کے لئے کتنے افسوں ہیں دل ہے کہ پھر بھی شاد نہیں

ooo

کیا اس سے بڑھ کے اور ہو توہینِ زندگی
دیوانگی میں چاکِ گریباں سلا ہوا

ooo

بے تابیِ دل کو نہ ملے مہلتِ آرام
اے اہلِ ستم! مشقِ ستم اور زیادہ

شاعری کی اساس عشق ہے نہ کہ ذخیرۂ الفاظ، عشقِ حقیقی ہو کہ عشقِ مجازی شعر کے لئے لازمی جُز قرار پایا ہے۔ وہ عشق ہی تو ہے جو پانی کے دیئے جلا دیتا ہے۔ وہ عشق ہی تو ہے جو عاشق و معشوق کو ایک ہی قبر میں دفنا دیتا ہے، وہ عشق ہی تو ہے جو آگ کو بھی گلزار بنا دیتا ہے، وہ عشق ہی تو ہے جس نے رات کی مانگ میں تاروں کو سجایا ہے، وہ عشق ہی تو ہے جس نے چاندنی رات میں چکور کو سرشار کیا، وہ عشق ہی تو ہے جس نے بھنورے کو پھول کے اطراف منڈلانے پر مجبور کیا، وہ عشق ہی تو ہے جس نے پروانے کو جل جانے کی لذّت بخشی، وہ عشق ہی تو ہے جس نے پانی کو روانی دی ہے، وہ عشق ہی تو ہے جس نے بادلوں کو برسنا سکھایا۔ وہ عشق ہی تو ہے جس نے آنکھوں کو چھلکنا سکھایا، وہ عشق ہی تو ہے جس نے جام کو جم، مینا کو ساغر، دل کو درد اور آنکھوں کو خواب عطا کیا، وہ عشق ہی تھا جس نے قلم کو لکھنے کا حکم دیا تھا یہ عشق ہی تو ہے کہ قلم اب تک لکھ رہا ہے، عشق کے ہی جلوؤں میں نہا کر قلم یہ لکھتا ہے:۔

ہائے کیا جلوے تھے جو آج نظر سے گذرے
ہم یہ اے بے خودیٔ شوق کدھر سے گذرے

ooo

اے اہل خرد! مجھ سے تم اتنے جو خفا ہو
کچھ میرے جنوں کا بھی تمہیں کاش پتہ ہو

جگن ناتھ آزاد نے شاعری کو قافیہ پیمائی کبھی نہیں سمجھا بلکہ انہوں نے شعر کو اپنے خیالات کی اُڑانوں کے پنکھ سے باندھا ہے اور وہ سارے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو وہ خود دیکھتے تھے۔ اور وہ سارے مناظر ان کی شاعری سے ظاہر ہیں کہ وہ کیا تصور کرتے ہیں۔ بہت مشکل ہو جاتا ہے عشقِ حقیقی کو شعر کے قالب میں ڈھالنا اور وہ بھی اس خوبی کے ساتھ کہ پڑھنے سے اس کا لطف دوبالا ہو جائے۔ اسکے لئے شاعر کا فکری رجحان ہی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ فنّی محاسن کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے' انہوں نے خود کہا کہ:

میرے کلام میں ہے اندھیرا بھی نور بھی
راتوں کی تیرگی بھی سحر کا ظہور بھی

جگن ناتھ آزاد نے ہر رنگ کے پھول ایک گلدستہ میں سجا کر نئی خوشبو سے شعری پیراہن کو مہکایا ہے۔ آزاد کی وہ تلاشِ خودی نغمۂ دل بن کر ہمیشہ احساس کی وادیوں میں گونجتی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعری درپن میں ان کی پرچھائی اب بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا عکس اب بھی نظر آتا ہے۔ اور یہ میرا یقین ہے کہ یہ سامانِ فسوں ہر دور میں مہیا ہوتا رہے گا:

عقل والوں کو جو بیگانۂ ادراک کرے
تری دنیا میں وہ سامانِ جنوں آج بھی ہے

☆☆☆

بے وقوف کی صحبت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے ایک پہاڑ کی طرف جا رہے تھے' ایک آدمی نے بلند آواز سے پکار کر کہا ''اے خدا کے رسولؑ آپ اس وقت کہاں تشریف لے جا رہے ہیں' وجہ خوف کیا ہے' پیچھے کوئی دشمن بھی نظر نہیں آتا''۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا ''میں ایک احمق آدمی سے بھاگ رہا ہوں۔ اس آدمی نے کہا ''یا حضرت آپ کیا وہ مسیحا نہیں ہیں جن کی برکت سے اندھا اور بہرا شفایاب ہو جاتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا' ہاں۔ اس آدمی نے کہا کیا آپؑ وہ بادشاہ نہیں ہیں جو مردے پر کلامِ الٰہی پڑھتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس آدمی نے کہا کیا آپ وہی نہیں ہیں کہ مٹی کے پرندے بنا کر ان پر دم کر دیں تو وہ اسی وقت ہوا میں اُڑنے لگتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا' بیشک میں وہی ہوں۔ پھر اس شخص نے حیرانگی سے پوچھا ''اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اس قدر قوت عطا کر رکھی ہے تو پھر آپؑ کو کس کا خوف ہے؟''

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا ''اس ربُّ العزت کی قسم کہ جس کے اسمِ اعظم کو میں نے اندھوں اور بہروں پر پڑھا تو وہ شفایاب ہو گئے' پہاڑوں پر پڑھا تو وہ ہٹ گئے' مردوں پر پڑھا وہ جی اُٹھے۔ لیکن وہی اسمِ اعظم میں نے احمق پر لاکھوں بار پڑھا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا''۔ اس شخص نے پوچھا یا حضرتؑ یہ کیا ہے کہ اسمِ اعظم اندھوں' بہروں اور مردوں پر تو اثر کرے لیکن احمق پر کوئی اثر نہیں کرتا حالانکہ حماقت بھی ایک مرض ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے جواب دیا ''حماقت کی بیماری خدائی قہر ہے''۔

درسِ حیات:

☆ بیوقوف کی صحبت سے تنہائی بہتر ہے۔

(حکایت نمبر 6' حکایاتِ مولانا روم ص:72)

عابد حسین گنائی
ریسرچ اسکالر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد-500032 (تلنگانہ)

فیض احمد فیضؔ کی حبسیہ شاعری

اُردو ادب کے جن شعرا کو قومی اور بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت کا مقام حاصل ہوا ہے اُن میں مرزا غالبؔ اور علامہ اقبالؔ کے بعد فیض احمد فیضؔ کا نام سب سے زیادہ نمایاں اہمیت کا حامل ہے ۔انہوں نے جب اُردو شاعری کی دنیا میں قدم رکھا' اُس وقت اُردو شاعری کے اُفق پر ایک طرف علامہ اقبالؔ آفتاب بن کر جگمگا رہے تھے تو دوسری اور جوشؔ کی انقلابی اور اختر شیرانیؔ کی رومانی شاعری کا چرچا تھا۔تو شاعری کی اُس فضا میں فیض احمد فیضؔ نے اپنی شاعری کا آغاز رومانی طرز سے کیا ہے۔شاعری میں وہ رومانیت سے انقلاب کا راستہ بہت ہی دلکش انداز میں طے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔فیضؔ نے ۱۹۲۸ میں مرے کالج آف سیالکوٹ کی ایک ادبی تنظیم ''اخوان الصفاء'' کے طرحی مشاعرے سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا جس میں انہوں نے غزل سنائی ۔ایک سال بعد فیضؔ نے غزل کے ساتھ اردو نظم کے میدان میں بھی قدم رکھا' جب انہوں نے ۱۹۲۹ میں گورنمنٹ کالج لاہور کے مشہور رسالے ''راوی'' میں اپنی پہلی نظم ''میرے معصوم قاتل'' کے نام سے شائع کی ۔اس طرح انہوں نے اردو ادب میں باقاعدہ اردو شاعری کا آغاز کیا۔ان کی شاعری کا پہلا شعری مجموعہ ۳۰ سال کی عمر میں ۱۹۴۱ میں ''نقش فریادی'' کے نام سے پہلی بار منظر عام پر آیا۔مجموعی اور عمومی طور پر مجموعے میں شامل نظموں اور غزلوں میں عشق و محبت کا رومان زیادہ چھایا ہوا ہے اور نوجوانی کے جذبات کی تمنائیں اور حسرتیں ان تخلیقات میں بہت زیادہ نمایاں ہیں۔نقش فریادی کی اشاعت کے گیارہ سال بعد فیض کا دوسرا شعری مجموعہ ''دست صبا'' ۱۹۵۲ میں شائع ہوا ۔ یہ شعری مجموعہ فیضؔ کی گیارہ سال کی مدت کی کاوشوں پر مبنی ہے جس میں اس دور کی سبھی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں ۔ فیضؔ کا شعور نقش فریادی کے مقابلے میں ''دست صبا'' اور ''زنداں نامہ'' میں زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے وہ اسیری کے چار سال کے دوران عوام سے زیادہ قریب ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے سیاسی شعور میں بھی نکھار پیدا ہوا۔زنداں کے تعلق سے فیضؔ خود ایک خط میں یوں تحریر کرتے ہیں ۔

''گرفتاری کے بعد میں نے ابھی ابھی چھٹی نظم ختم کی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ گزشتہ تین ماہ میں جتنا کچھ لکھا تھا

ان تین مہینوں میں اس سے دوگنا لکھ چکا ہوں''۔ [1]

اس طرح فیضؔ کی شاعرانہ زندگی پر زنداں کا بڑا خاصا اثر پڑا۔جیل کے حالات کی وجہ سے فیضؔ کی شاعری کا کینوس اور وسیع تر ہوا۔اس میں ایک نیا رنگ' ایک نئی جہت اور ایک نئی طول وعرض پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن پر جیل سے باہر کے آدمی روزمرہ کی زندگی میں غور وخوض نہیں کیا کرتے۔مصروفیات کی وجہ سے اُن کا حسن اور بدصورتی نظر نہیں آتی۔اس لحاظ سے تو انسان کی حیات اور طرز احساس جو ہے وہ جیل جا کر اور زیادہ نازک ہو جاتا ہے جس سے انسان کے اندر بڑی حساسیت یعنی نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور زنداں میں رہ کر انسان کو باقی سارے عالم موجودات پر نظر ڈالنے کی زیادہ فراغت ملتی ہے۔اس طرح فیضؔ نے زنداں کے سفر کے دوران نہ صرف افریقہ یا فلسطین یا بیروت پر نظمیں کہیں بلکہ دوسری چیزوں کو بھی بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا جن کے بارے میں باہر کی دنیا اور زیادہ نزدیک ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں فیضؔ کے الفاظ کچھ اس طرح کے ہیں:

''ذہنی طور پر جیسی آزادی جیل خانے میں ملتی ہے وہ باہر کی دنیا میں نہیں ملتی۔اس لیے کہ باہر تو روزمرہ کی الجھنیں اور تکلیف ہے اور دوسرے بہت سارے کام ہوتے ہیں ان میں آدمی اتنا الجھا ہوا ہوتا ہے کہ پورے کینوس کو دیکھنے کی فراغت نہیں ملتی۔اس طریقے سے جیل خانے میں ذہن باہر کی دنیا سے زیادہ کھل جاتا ہے''۔ [2]

فیضؔ نے اسیری کے دوران خود پر لگائے ہوئے الزامات' قید کے اندر شدائد' غم وغصہ اور مایوس کرنے والی ہر تکلیف کو شاعری کے پیرائے میں نہایت ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔اس سے فیضؔ کے جذبات میں شدت اور موضوعات میں وسعت پیدا ہوگئی۔اسیری نے فیضؔ کی شاعری کے معیار اور مقدار کو بھی بلند کیا۔اگر ان کے بہترین شعری سفر پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی بہترین شاعری کا نمونہ اسیری کے دوران سامنے آیا۔اگرچہ بعض لوگ فیض کے پہلے شعری مجموعے نقش فریادی کے کلام کو بھی معیاری شاعری میں شمار کرتے ہیں لیکن بطور شاعر ان کا مقام و مرتبہ اسیری کے زمانے میں بہت زیادہ بلند ہوا۔ڈاکٹر وزیر آغا اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں۔

''فیض قید و بند کے واقعہ سے پہلے ایک خاص رفتار سے رواں دواں تھے۔شخصیت کی نمو شاعری کے ارتقاء سے ہم آہنگ تھی' لیکن پھر اچانک وہ مقید ہوگئے اور وہ ایک ایسے الزام کے تحت جس نے انہیں رات ہی رات میں قومی کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر مشہور کر دیا''۔ [3]

گویا اس سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ فیضؔ کی غیر معمولی شاعرانہ شہرت میں اسیری کے چار سالوں کا بڑا ہی نہایت اور مثبت کردار رہا ہے جس کی بنا پر وہ اردو میں مظلوم اور مقبول ٹھہرے۔فیضؔ نہ صرف اپنے دور میں دانشور طبقے سے وابستہ تھے بلکہ انہوں نے زیادہ تر زندگی مزدوروں' محنت کشوں اور کسانوں کے

ساتھ گزاری۔اردو ادب کے بہت سارے ناقدین نے فیض کی اسیری کے زمانے کی شاعری کو بہت سراہا اور داد دی۔سجاد ظہیر نے فیضؔ کی اسیری کی شاعری کو اُس عہد کی آواز قرار دیا۔اسیری سے پہلے فیض ترقی پسند شعراء میں اتنے مشہور نہ تھے جتنے اسیری کی زندگی گزارنے کے بعد ہوئے۔اس بارے میں اردو ادب کے مشہور محقق ڈاکٹر رشید حسن خان کے الفاظ کچھ اس طرح کے ہیں۔

''۱۹۵۱ سے پہلے یعنی ان کے جیل جانے سے پہلے ترقی پسند ناقدین نے ان کی شاعری کی طرف زیادہ التفات نہیں کیا تھا لیکن جب سے وہ سجاد ظہیر کے ساتھ جیل گئے تب سے ان کو ''شاعر مجاہد'' مان لیا گیا۔اور اس زمانے سے سیاسی حلقوں نے مختلف سطحوں پر ان کی ''مجاہدانہ'' شہرت کے لیے راہ ہموار کی''۔ ۴

فیضؔ کی اردو شاعری میں مقبولیت کی خاص وجہ اُن جذبات و کیفیات کا بیان ہے جو انہوں نے اسیری کے پیرائے میں بیان کیے ہیں۔اردو ادب میں اس موضوع سے متعلق بہت سارے شعرا نے شاعری کی لیکن بعض سیاست کے الزام کی وجہ سے مقید کیے گئے اور بعض شعرا نے بنا تجربے کے جیل میں زندگی گزارنے سے متعلق شاعری کی۔ لیکن جب یہی اسیری کا موضوع حقیقی' ذاتی تجربے اور درد و غم کے ساتھ نظم کیا جائے گا تو وہ کتنا حسین' دلکش اور اثر انداز ہوگا۔جو فیضؔ کی شاعری میں موجود ہے چونکہ فیض کی شاعری میں چاہے نظم ہو یا غزل میں اس جیسی بہت ساری تراکیب' تشبیہات و استعارات دیکھنے کو ملتے ہیں۔فیضؔ کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ تصور کی جاتی ہے کہ انہوں نے شاعری کے دوران استعمال ہونے والے بہت سارے استعاروں کو نئے معنی و مفاہیم میں ڈال کر تحریر کیا ہے۔انہوں نے روایتی کلاسیکی شاعری کی علامات کو اپنے عہد کے منظر نامے سے ہم آہنگ کر دیا۔اس طرح وہ روایت سے وابستہ ہو کر جدت کی راہ پر گامزن ہوئے۔اس سے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر یوں رقم کرتے ہیں۔

''فیض نے ایام اسیری کی غزلیات میں غزل کے اس مخصوص اظہار سے وابستہ سہولتوں سے ہر ممکن طریقے سے فائدہ اٹھایا اور فیض کے لیے یہ مشکل بھی نہ تھا کہ ان کا فنی شعور غزل کی کلاسیکی روایات سے یوں رنگا ہوا ہے کہ اظہار کی ہر منزل ان کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔یہی نہیں اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ فیض کے اشعار ہیں اور جیل میں لکھے گئے تو انہیں کسی بھی کلاسیکی شاعر کا کلام سمجھا جا سکتا ہے''۔ ۵

فیضؔ نے کبھی اپنے ذہن کو سونے نہیں دیا بلکہ ہمیشہ بیدار رکھا اور یہی وجہ ہے کہ قید کی زندگی گزارنے کے باوجود ان کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سلب نہیں ہوئی بلکہ اُس سے اور بھی زیادہ تقویت ملی۔انسانوں سے دور رہ کر وہ انسانوں کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔کیونکہ وہ عوام کو سرمایہ داروں' ظالموں اور جابر حکمرانوں کے خلاف لڑنے پر ہمیشہ اکساتے رہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کسی بھی حالت میں غریب اور مظلوم طبقے کو مایوس اور حوصلہ شکن نہیں کرتی بلکہ ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے دکھائی

دیتی ہے تا کہ غریب، محنت کش اور نچلے طبقے کے ساتھ تعلق رکھنے والے وہ مظلوم لوگ ان ظالموں اور جابر حکمرانوں کے خلاف اپنی آواز ایک ساتھ اُٹھا سکیں۔ فیضؔ سے پہلے والے شعراء کے یہاں ایسی زنداں کی شاعری نہیں ملتی۔ اسیری کے چار سال فیضؔ کی شاعری کے لیے انوکھے ثابت ہوئے۔ اسیری کی زندگی گزارنے سے فیضؔ کا رشتہ عوام سے ٹوٹنے کے بجائے ایک نئے مثبت انداز میں استوار ہوا۔ اس طرح زنداں کے چار سال فیضؔ کے لیے بہت تخلیقی ثابت ہوئے۔ جس کا تذکرہ فیضؔ نے کچھ اس طرح سے کیا ہے:

''میرے لیے جیل کا تجربہ ایسا ہی تھا جیسا جوانی کے آغاز میں پہلا عشق''

دوسری جگہ یوں تحریر کرتے ہیں:

''جیل خانہ میری شاعری کا زرخیز دور تھا کیونکہ جیل میں کوئی اور مصروفیت نہیں تھی، کوئی کام نہیں تھا۔ جیل کا زمانہ ایسا ہے جیسے پھر سے عشق کر لیا جائے۔ جیسے عشق میں خواہ مخواہ شعر بہتے چلے جاتے ہیں، ویسے ہی جیل میں انسان جذبات کی رو میں بہہ کر شعر کہتا ہی چلا جاتا ہے''۔ [۶]

فیضؔ جیسے حساس شاعر نہ صرف اپنے ملک کے لوگوں پر ہو رہے ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں بلکہ دوسرے ملکوں سے تعلق رکھنے والے مظلوم طبقے اور غریبوں پر ہو رہے استحصال کے خلاف بھی فیضؔ نے ہمیشہ آواز اُٹھائی ہے۔ اس طرح ان کی انسان دوستی کی سرحدیں نہ صرف برصغیر تک محدود رہیں بلکہ ہند پاک سے باہر وہ دوسرے ملکوں میں بھی داخل ہو جاتی ہے جس سے فیضؔ کی شاعری عالمی سطح کی شاعری بن جاتی ہے جس کے بہترین نمونے ہمیں افریقہ، فلسطین، روس اور بیروت کے علاوہ دوسرے ملکوں سے متعلق نظموں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فیضؔ نے انسانی ہمدردی، حب الوطنی، دکھ درد اور معاشرے کی سماجی اور معاشی بدحالی کا تذکرہ بھی خوب اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ ایک دردمند اور حساس دل رکھنے والے انسان پر زنداں کے تکلیف دہ اور دل آزار ماحول کا برا اثر پڑتا ہے لیکن فیضؔ جیسے انسانیت پسند، رحم دل، ذہین اور دردمند دل رکھنے والے پر شخص پر زنداں کے سنگلاخ سفر اور تنہائی اپنا برا اثر نہ ڈال سکی۔ انہوں نے اسیر ہو کر بھی حب الوطنی کے گیت گائے اور ایسی تحریریں یادگار چھوڑی ہیں جو اپنی مثال آپ ہے۔ زنداں کے آلام و مصائب نے انہیں غریبوں کے دکھ درد سے زیادہ قریب تر کر دیا۔ جس سے فیضؔ کے انداز فکر میں زیادہ بالیدگی پیدا ہو گئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالمغنی یوں تحریر کرتے ہیں۔

''زنداں نامہ کو ہم فیضؔ کی شاعری کا نقطہ عروج کہہ سکتے ہیں''۔ [۷]

تو اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب زنداں میں اندھیرے کی مہر لگتی تھی تو اس وقت فیضؔ جیسے حساس اور درد مند دل رکھنے والے شخص کے ذہن کے دریچے وا ہو جاتے تھے اور اس طرح نور سحر کی کرن اشعار بن کر اس کے کھلے دل و دماغ کو منور کرنے لگتی تھی۔ فیضؔ کی شاعری میں امید کی کرن ہر جگہ جگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ فیضؔ کی زنداں کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے ایک قریبی دوست افتخار عارف یوں رقمطراز ہیں۔

''دنیا بھر کی حبسیہ شاعری میں فیضؔ کے ''زنداں نامہ'' کو بہت نمایاں مقام حاصل ہے ناظم حکمت' پابلو' کارڑنیل اور ہمارے زمانے میں جالبؔ' شورش کشمیریؔ' اور بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے زنداں کی زندگی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں مگر حبسیہ شاعری میں جو مقام فیضؔ کے ''زنداں نامہ'' کو حاصل ہے وہ شاید ہی کسی اور کتاب کو حاصل ہوگا''۔ ۸

فیضؔ کی شاعری انسانی جذبات اور سماجی انسلاکات سے پُر ہے۔ انہوں نے عصری مسائل' فکری رجحانات' عوام پر بڑھتے ہوئے مظالم' بہیمانہ استبداد اور غیر یقینی ملکی حالات و انتشار اور قلبی واردات کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ خصوصاً استحصال اور طبقاتی کشمکش پر توجہ مرکوز کی۔ انہوں نے اردو ادب کی شاعری میں نت نئے اظہاری پیرائے وضع کیے اور بہت سارے لفظوں' ترکیبوں اور اظہاری سانچوں کو اُن کے صدیوں پرانے معنی و مفاہیم سے نکال کر نئے معنیاتی نظام کی صورت گری کی ہے۔ فیضؔ کے یہاں یہ صلاحیت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے کہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ سیاسی' سماجی اور معاشی مسائل کو بڑی ندرت اور چابکدستی سے پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں احساس کی شدت' جذبے کی حرارت اور فکر کی تاثیر موجود ہے انسانیت فیضؔ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے وہ غم کائنات کو اپنا ذاتی غم سمجھ کر اسے اپنی تحریروں میں پیش کر دیتے ہیں۔ فیضؔ نے اپنی شعری تخلیقات کے ذریعے معاشرے کو ایک خاص نہج پر لے جانا چاہا۔ مقصدیت اور شعریت کے امتزاج سے انہوں نے اپنی انفرادی شناخت قائم کی' ان کی شاعری نے انسان دوستی کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے سیاسی و سماجی مسائل کو فن کے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ اس طرح فیض کی شاعری میں اسیری کے تجربے کا بہت اہم کردار رہا ہے جس نے نہ صرف ان کی بلکہ اُردو شاعری کو نئے رنگ عطا کیے۔ اسی لیے آج بھی فیضؔ کی شاعری اپنے مخصوص لب ولہجہ کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں زندہ جاوداں ہے:

ہم نے جو طرز فغاں کی تھی قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

☆☆☆

حوالہ جات:۔

۱۔ صلیبیں میرے دریچے میں' فیض احمد فیضؔ' ص۴۲
۲۔ ڈاکٹر ایوب مرزا' فیضؔ نامہ' ص۵۴۳
۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا' مضمون فیضؔ اور ان کی شاعری' مرتب اشفاق حسین' ص۴۷
۴۔ رشید حسن خان بحوالہ فیضؔ شناسی' از تقی عابدی' ص۱۱
۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر' فیضؔ معتدل گرمی گفتار کا شاعر' ص۵۵۵
۶۔ ڈاکٹر ایوب مرزا' فیضؔ نامہ' ص۵۴۴
۷۔ ڈاکٹر عبدالمغنی' جدید اردو شاعری میں فیضؔ کا مقام' ص۳۴۳۔
۸۔ افتخار عارف' ہمارے فیضؔ' ص۱۲۶

☆☆☆

سجاد احمد صوفی
ریسرچ اسکالر
سنٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد
گچی باؤلی، حیدرآباد 046 500 (تلنگانہ)

موضوع کا جادوگر (احمد فراز)

ابھی کچھ اور کرشمے غزل کے دیکھتے ہیں
فرازؔ اب ذرا لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں

احمد فرازؔ کی شخصیت اور ان کی غزل گوئی اپنے آپ ایک مثال ہے۔ جن ملکوں میں اُردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہاں احمد فرازؔ محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ ان کی غزل گوئی نے ساری دنیا میں اُدھم مچادی۔ موجودہ دور کی غزل گوئی کا تصور احمد فرازؔ کے بغیر ناممکن ہے۔ چاہے وہ مشاعرہ ہو، موسیقی ہو یا کوئی اور محفل ہو، احمد فرازؔ کا شعر ان محفلوں میں نہ سنا جائے یہ ناممکن ہے۔ احمد فرازؔ کی غزلیں گلوکار مہدی حسن، اقبال بانو، بیگم اختر، غلام علی اور ملکہ پکھراج جیسی ہستیوں نے اپنی سریلی اور نرالی آوازوں میں گائی ہیں۔ احمد فرازؔ صرف اُردو والوں میں ہی نہیں بلکہ شعری ذوق رکھنے والے ہر حلقوں میں پسند کیے جاتے ہیں اور اسی لیے ان کے مجموعے کے کئی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ ہندی میں تو ان پر کئی کتابیں چھپ چکی ہیں اور ہندی کے رسالوں میں بھی ان کی شاعری شائع ہوتی رہی۔ یہاں ہم لہجہ بدل کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں:

رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرازؔ کی شاعری درد عشق کی ایک سچی شاعری ہے جس میں وصال سے زیادہ ہجر کا کرب نمایاں ہوتا ہے۔ فرازؔ کی درد عشق کی شاعری میں انتظار کی کیفیت اور محبوب کی جستجو نظر آتی ہے جس میں فرازؔ اپنے محبوب کو پانے سے پہلے کھونے کے ڈر کا احساس دلاتا ہے۔ اس درد میں یہ بھی یاد آتا ہے کہ ملنے کے بعد بچھڑنا ضروری ہے۔ فرازؔ ان اشعار سے ہمیں محبت کی قیمت اور محبت میں حوصلہ افزائی کا احساس کرتے ہیں۔ فرازؔ کا عقیدہ شاید یہ ہے کہ اگر محبوب کو بچھڑنا ہے تو ہنسی خوشی سے بچھڑ جائے۔ کوئی بہانہ بنا کر اپنے محبوب سے بچھڑنا محبوب کے لیے رسوائی کا سبب بنا سکتا ہے۔ یہ شعر

دیکھئے:

ہنسی خوشی سے بچھڑجا اگر بچھڑنا ہے
یہ ہر مقام پہ کیا سوچتا ہے آخر تو

فرازؔ کے جذبات و احساسات میں اتنی سچائی ہوتی ہے کہ انسانی زندگی کی حقیقت کی ترجمانی معلوم ہوتی ہے جو کہ اس طرح سے قاری کے جذبات واحساسات میں گھل جاتے ہیں کہ انہیں اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ فرازؔ کے اشعار لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں اور ذہن میں نقش ہوجاتے ہیں جس کو فرازؔ بڑی سادگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ مدھم لب و لہجے میں اپنے احساس و جذبات کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ شعری پیکر میں اپنی بات بیان کردیتے ہیں۔اور یہی اندازِ بیان ان کی پہچان بن جاتی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے:

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سواس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کو بھی ہے شعروشاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہیں
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

ان اشعار میں کس طرح فرازؔ نے اپنی محبوب کی تعریف کی ہے اور کس طرح کے لفظوں کا استعمال کیا ہے جیسے آنکھ بھر، معجزے، بدن کی تراش وغیرہ اس طرح کے لفظ جو عام ہیں لیکن انہوں نے بڑے دلکش انداز میں پیش کئے ہیں جس سے محبوب کا پورا سراپا آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔اس طرح کی تعریف اوردوسری چیزوں سے مماثلت دی ہے کہ قاری کو اپنے محبوب کی ادائیں یاد آتی ہیں۔یہی خصوصیت فرازؔ کوایک بالاتر شاعر ثابت کرتی ہے۔ ان کے پاس الفاظ کی جنبش ہے اور وہ ایک عام لفظ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ کچھ نیا ہی معلوم ہوجاتا ہے۔ لفظوں کا استعمال ان سے بہتر کون جانتا ہے۔

احمد فرازؔ نے جہاں ایک طرف اپنی شاعری میں عشق ومحبت کے جذبے کو فروغ دیا وہیں دوسری طرف پاکستان میں فیضؔ کے بعد جبرواستحصال اور اعلیٰ اقدار حیات کی بے حرمتی کے خلاف اپنی آواز بلند کی کیوں کہ فرازؔ جمہوری نظام کے قائل تھے، وہ انسانیت کی حکومت چاہتے تھے، وہ مساوات کا نظریہ رکھتے تھے۔ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف غمِ جاناں کا ذکر ملتا ہے وہیں دوسری طرف غمِ دوران کا بھی ذکر شامل ہے۔جس میں دھوپ اور چھاؤں کی کیفیت موجود ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

کب ہم نے کہا تھا ہمیں دستار و قبا دو
ہم لوگ نواگر ہیں ہمیں اذن نوا دو

احمد فرازؔ کے بارے میں یہاں ہم ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

'' احمد فرازؔ اچھی شاعری میں موثر احتجاج کرسکتے ہیں۔ سیاسی نعرہ بازی کے بغیر وہ فیض کی طرح رسیلی شعریت میں گھناؤنی زیادتیوں کے خلاف آواز اُٹھا سکتے ہیں۔وہ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنے کا ہنر جانتے ہیں اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ جبرواستحصال کو للکار سکتے

ہیں اور ریاکاری کو آئینہ دکھا سکتے ہیں۔ احتجاج کی یہی خواہش اُن کو اس دعا پر مجبور کرتی ہے:

یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پر
یا میرے زخم کو بھر یا مجھے گویائی دے''

(مسعود مفتی)

مندرجہ ذیل بالا اقتباس میں فرازؔ اور فیضؔ کی شاعری میں مماثلت اور اس میں احتجاج اور وطن پرستی کا اندازہ اس عبارت سے لگا سکتے ہیں۔ احمد فرازؔ تو کسی نظریے سے وابستہ نہیں تھے مگر ان کے احتجاج کی آواز نے انسانیت کے درد کو ان کی شاعری میں ترقی پسند کی جھلک موجود کردی ہے۔ ویسے بھی فرازؔ سب سے زیادہ جس شاعر یا شخصیت سے متاثر تھے تو وہ فیض احمد فیضؔ ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ کچھ نہ کچھ خوبی فرازؔ کے یہاں موجود تھی جس کی بنا پر ہمارے اردو ادب کے بہت سارے ناقدین فرازؔ کو فیضؔ کا جانشین سمجھتے ہیں۔ اور یہ بات حقیقت بھی ہے کہ فیضؔ کی جانشینی ہم عصر شعراء میں سب سے زیادہ فرازؔ کو نصیب ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ہم فرازؔ کا یہ کلام دیکھتے ہیں:

کتنی بانہوں کی ٹہنیاں ٹوٹیں
کتنے ہونٹوں کے پھول چاک ہوئے
کتنی آنکھوں سے چھن گئے موتی
کتنے چہروں کے رنگ خاک ہوئے

اس بات کا اندازہ فیضؔ کو بھی ہوا تھا۔ وہ بھی احمد فرازؔ کے کلام سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ احمد فرازؔ میں وطن کا غم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا اگر میرے بعد میری شعری روایت کا قائل کوئی ہے تو وہ فرازؔ ہی ہو سکتے ہیں۔ اس تناظر میں ہم یہاں فیض احمد فیضؔ کا خیال فرازؔ کے بارے میں نقل کرتے ہیں:

''احمد فرازؔ کا پہلا مجموعہ کلام ''تنہا تنہا'' شاعری ہے شعر کی تلاش نہیں ہے۔ ان کے کلام میں خیال اور جذبے کا قالب اور شعر اور لباس الگ الگ دکھائی نہیں دیتے۔ آپس میں پیوست ہیں۔ شاعر کو یہ بات تب نصیب ہوتی ہے، جب اس کا جذبہ اور اس کا فن دونوں یکساں، پرخلوص اور سچے ہوں۔ یہی خلوص، گداز اور سچائی احمد فرازؔ کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اسی خلوص کی وجہ سے یہ حدیثِ دل کے علاوہ زندگی کی وسیع تر حقائق کا بیان بھی ویسی ہی خوبی اور لگن سے کرتے ہیں۔ بیک وقت غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی وسیع دنیاؤں سے آگہی اور اس کی موثر تفسیر مشکل کام ہے۔ احمد فرازؔ اس کام میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔'' (فیض احمد فیضؔ)

اس اقتباس میں فیضؔ نے صاف لفظوں میں فرازؔ کے کلام کی سچائی، خلوص، گداز کو بیان کیا ہے کہ کس طرح فرازؔ نے زندگی کی حقیقت کو شاعری کے پیرائے میں باندھا ہے اور کس طرح قاری کے ذہن میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیضؔ جیسا شاعر، جب کسی ہمعصر کے بارے میں رائے دے تو وہ کوئی معمولی شاعر نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ

احمد فرازؔ کی ذہانت اپنے دور کے نئے تقاضوں سے پوری طرح باخبر تھی۔ انہوں نے ظلم و جبر اور استحصال کی بے رحم طاقتوں کے مقابلے میں اپنے وطن کے اور دنیا کے کمزور اور دبے کچلے انسانوں کی طرف داری کا عہد کیا تھا اور اس جدوجہد میں اپنے آپ کو کسی بھی طرح کمزور نہیں ہونے دیا اور قربانیاں دے کر آگے بڑھتے رہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اے خدا تری مخلوق، جبر کے اندھیروں میں
دفن ہو چکی کب کی، تیرے آسمانوں سے
نامزد فرشتوں کی اب سفارتیں کیسی

گرچہ احمد فرازؔ نے اپنی شاعری میں کسی فلسفہ کی بات پیش نہ کی ہو لیکن غزلوں میں معنی آفرینی موجود ہے اور معنی آفرینی کا ہنر بڑے فنکاروں کو ہی نصیب ہوتا ہے جو زندگی کے ہر تجربے کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان میں معنی کی کئی پرتیں اپنے آپ ہی نکل جاتے ہیں جو فرازؔ کے ان اشعار میں ملتا ہے:

میں نے دیکھا بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا
مجھ سے کیا ڈوبنے والوں کا پتہ پوچھتے ہیں
میں سمندر کا حوالہ نہ کنارے کی مثال

فرازؔ نے پیار، خلوص، چاہت یعنی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنی شاعری میں سمولیا ہے۔ اس کے برخلاف انہوں نے دشمنوں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنا کر ان سے ہمیشہ گلے لگانے کی بات کی ہے اور ان کے دلوں میں بھی محبت کی شمع جلانے کی کوشش کی ہے۔ جیسے:

ستم گری کا ہر انداز مجرمانہ لگا
میں کیا کروں مرا دشمن مجھے برا نہ لگا
میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی
ترے لیے مرے دل سے دعا نکلتی ہے
آ گلے تجھ کو لگا لوں میرے پیارے دشمن
اک مری بات نہیں تجھ پہ بھی کیا کیا گزری

دشمنوں سے لے کر فرازؔ نے رشتوں میں پڑی دراڑ کو بھی چھوا ہے۔ رشتے ترک تعلق ہو جاتے ہیں تو فرازؔ نے اسے کسی عذاب سے کم نہیں سمجھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت
ترک محبت کرنے والو! تم تنہا رہ جاؤ گے
آج تو اے دل ترک تعلق پر تم خوش ہو
کل کے پچھتاوے کو بھی امکان میں رکھنا

احمد فرازؔ کی شاعری میں ہمیں صرف عشق و عاشقی، غم و درد، وطن پرستی، ظلم کے خلاف احتجاج، سیاست سے بے زاری کے موضوع ہی نہیں ملتے بلکہ انہوں نے تو خدا کی عظمت کو بھی خوب سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاج میں قناعت پسندی جھلکتی ہے۔ وہ ہر حال میں خدا اور رسول خدا کا شکر اور تعریفیں ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں اس تناظر میں کچھ اشعار پیش کرتے ہیں:

ذرّے ذرّے میں آباد جہاں
خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو
میرے رسولؐ کہ نسبت تجھے اجالوں سے

میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے
نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں میں

احمد فرازؔ نے اپنے کلام میں تشبیہات، استعارات، علامتیں، محاکات، پیکر تراشی اپنی شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ فرازؔ نے تخلیقی فضا کو تشبیہات اور علامت نگاری میں قائم رکھا ہے۔ فرازؔ نے اپنی شعری پیکر کو روایت کے ساتھ نئے تقاضوں میں ڈھالا ہے۔ غزل ہو یا نظم شعری پیکروں کی نرمی اور سبک روی ان کے یہاں تازگی اور تاثر کی ایک نئی فضا پیدا کرتی ہے۔ ان کی تشبیہات کے کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں فرازؔ کی نئی آواز سنائی دیتی ہے۔ کچھ تشبیہات تو ایسی ہیں کہ فرازؔ کے علاوہ اُردو شاعری میں ابھی تک کسی نے نہیں پیش کیے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے:

ہم ترے شوق میں یوں خود کو گنوا بیٹھے ہیں
جیسے بچے کسی تہوار میں گم ہو جائیں

اس شعر میں فرازؔ جس طرح بچے کسی تہوار میں خوشی سے گم ہو جاتے ہیں اسی طرح فرازؔ بھی اپنے محبوب کے پیار میں گم سا ہو گیا ہے۔

اس قدر دنیا کے دوکھا اے خوبصورت زندگی
جس طرح تتلی کوئی مکڑی کے جالوں میں ہے

اس شعر میں تتلی اور مکڑی کو تشبیہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے کہ جس طرح دنیا میں خوشی موجود ہے اسی طرح غم بھی موجود ہے۔ جس طرح تتلی خوب صورت نظر آتی ہے مگر جب وہ مکڑی کے جال میں پھنس جاتی ہے تو نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ اس شعر میں فرازؔ نے تتلی کو خوبصورتی اور مکڑی کو دھوکے سے تشبیہ دے کر ہمیں زندگی کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

اس شعر میں پھول کا خیال آتے ہی نزاکت، خوبصورتی، مہک، لچک پن وغیرہ کا تصور ذہن میں ابھر آتا ہے۔ فرازؔ اپنی محبوب کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے محبوب کو دیکھ کر پھول بھی اپنے کپڑے چاک کرتا ہے، یعنی اپنے محبوب کے بدن کو پھول سے تشبیہ دیتا ہے۔ فرازؔ کے کلام میں ہمیں بہت ساری ایسی مثالیں مل جائیں گی۔

اسی طرح فرازؔ نے استعارات کو بھی بخوبی استعمال میں لایا ہے:

تیز سورج میں چلے آتے ہیں مری جانب
دوستوں نے مجھے صحرا شجر جانا ہے
وداع یار کا منظر فرازؔ یاد نہیں
بس ایک ڈوبتا سورج مری نظر میں رہا

پہلے شعر میں فرازؔ یہ کہتا ہے کہ جب میرے دوست کسی مصیبت میں ہوتے ہیں تو وہ مجھے شجر جیسے استعمال کرتے ہیں یعنی درخت کے مانند مجھے سمجھتے ہیں۔ دوسرے شعر میں جب میرا یار مجھ سے جدا ہوا، تو میری آنکھوں میں بس اندھرا سا چھایا اور مجھے کچھ یاد نہیں لیکن وہ منظر اس طرح لگا جس طرح ڈوبتا سورج نظر آتا ہے۔ یعنی

ڈوبتا سورج کا وہ سرخ پن جو حسین سا منظر لگاتا ہے اسی طرح ان کو اپنا محبوب جاتے جاتے لگا۔

اب فرآز کی علامت نگاری پر نظر ڈالتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے اپنے اشعار میں علامتوں کا استعمال حسین انداز میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

چراغ بجھتے ہی رہتے ہیں پر جو اَب کے ہُوا
اسے ہواؤں کا دیوانہ پن کہا جائے

اس شعر میں چراغ کی علامت پیش کی گئی ہے جس میں فرآز نے معنی کی تہہ داری جذب کر دی ہے۔ اس شعر کو اگر کشمیر کے حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس بات کی پوری عکاسی ملتی ہے کہ اس دنیا کے نظام میں جہاں لوگ مرتے رہتے ہیں' زندگی کے چراغ بجھتے رہتے ہیں، ہوا چلتی رہتی ہے، کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جو اب کے ہوا چلی ہے (8 جولائی 2016 میں) اس نے پوری وادی (تمام چراغوں کو) روند کر رکھ دیا ہے اور انسانی زندگی کے چراغوں کو بجھا کر رکھ دیا ہے:

چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے
پیڑ گرتا ہے تو آ جاتے ہیں آرے لے کر

دوسرے شعر میں فرآز پیڑ کو علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پیڑ کے سایہ میں رہنے والے ہی اس پیڑ کو کاٹتے ہیں جس طرح کوئی بڑا بزرگ کسی بچے کو پالتا پوستا ہے' پھر اس بزرگ کے مرنے پر اس کی وراثت پر لڑتے ہیں یا کوئی کسی کو رہبری کرتا ہے' پھر وہ اسی کے ساتھ دھوکہ بازی کرتا ہے۔

فرآز نے سورج، آگ، چراغ، شمعیں اور سمندر وغیرہ جیسے علامتیں استعمال کیے ہیں۔ سب سے زیادہ ان ہی علامتوں کو فرآز نے استعمال میں لایا ہے۔

اسی طرح فرآز نے محاکات اور پیکر تراشی سے بھی اپنی شاعری سجائی ہے:

پکارتے رہے محفوظ کشتیوں والے
میں ڈوبتا ہوا دریا کے پار اتر بھی گیا

سنا ہے دن کو اسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

ان اشعار میں محاکات ملتے ہیں پہلے شعر میں محفوظ کشتیوں والے ڈوبنے والے کو آواز دیتے ہیں مگر وہ ڈوب کے تیرتا ہو ساحل پار کرتا ہے:

سناٹے کی جھیل میں تو نے
پھر کیوں پتھر پھینک دیا ہے

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

اوپر کے اشعار میں پیکر تراشی کی مثالیں ملتیں ہیں۔ فرآز کی شاعری میں ہمیں اس طرح کی بہت ساری غزلیں ملتی ہیں جو تشبیہات، استعارات، محاکات' علامتیں اور پیکر تراشیوں سے لیس ہیں اس کے ساتھ ساتھ فرآز نے اپنے کلام میں بہت سی صنعتیں بھی استعمال کی ہیں مثلاً تضاد، مراعاۃ النظیر، سوال و جواب، تلمیح، حسن تعلیل وغیرہ کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

مختصراً احمد فرازؔ نے ہر طرح کے موضوع کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ گرچہ وہ غزل اور نظم کے شاعر تھے لیکن میرے خیال میں وہ زیادہ غزل کے ہی شاعر نظر آتے ہیں۔ غزل میں انہیں اولیت حاصل ہے۔ نظم کے مقابلے غزل بڑی ہنرمندی کا کام ہے اور یہ ڈھنگ ان میں موجود ہے۔ غزل لکھنا نظم سے بہت مشکل چیز ہے کیوں کہ غزل میں ہمیں صرف دو مصرعوں میں پوری بات کہنی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس پوری نظم میں ہم اپنی بات ختم کرتے ہیں۔ پھر بھی فرازؔ نے یہ مشکل راستہ اختیار کیا اور بڑی سادگی اور موثر انداز میں۔ اتنی موثر کہ بات دل میں گھر کر جاتی ہے' اور یہی وجہ ہے کہ فرازؔ کی غزل کے اشعار لوگوں کے ذہن میں نقش رہتے ہیں۔ ان کے جذبے اور فکر میں وہ باسی پن ابھی تک پیدا نہیں ہوا جو اکثر لوگوں کے یہاں دو چار مجموعوں کے بعد پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے ادب میں ان کے عہد کے شعراء میں سے ایک فرازؔ ہیں جنہوں نے عشق کے درس کو عام کیا تو اعلیٰ اقدار حیات کی بے حرمتی کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی۔ انہوں نے عصری حالات پر گہری نظر رکھی اور انسانی رشتوں کا احترام کیا اور دوسروں کو بھی سکھایا۔ اس کے ساتھ ساتھ خدا کی عظمت اور وحدت کو خوب سمجھا اور سمجھایا۔ فرازؔ کی شاعری کو مدنظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے فیضؔ کے بعد بیسویں صدی کے چند بڑے شعراء کی فہرست میں اُن کا نام ضرور شامل ہوگا۔ اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اتنی بڑی کہکشاں میں احمد فرازؔ اپنے لیے ایک قابلِ فخر مقام بنائے ہوئے ہیں۔

آخر میں فرازؔ کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

غمِ حیات کا جھگڑا مٹا رہا ہے کوئی
چلے آؤ کہ دنیا سے جا رہا ہے کوئی
ازل سے کہہ دو کہ رک جائے دو گھڑی
سنا ہے آنے کا وعدہ نبھا رہا ہے کوئی
وہ اس ناز سے بیٹھے ہیں لاش کے پاس
جیسے روٹھے ہوئے کو منا رہا ہے کوئی
پلٹ کر نہ آ جائے پھر سانس نبضوں میں
اتنے حسین ہاتھوں سے میت سجا رہا ہے کوئی

☆☆☆

اقوال حضرت امام حسینؓ

☆ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا خود ایک ظلم ہے۔
☆ اللہ کے سوا کبھی بھی' کسی سے کوئی سوال مت کرو۔
☆ جس کا مددگار اللہ کے سوا کوئی نہ ہو' خبردار اس پر ظلم نہ کرنا۔
☆ علم اور بردباری انسان کی سیرت کو آراستہ کرتی ہے۔
☆ ذلت برداشت کرنے سے موت بہتر ہے۔
☆ ذلیل وہی ہے جو بخیل ہے۔
☆ تقویٰ اور نیکی آخرت کے لئے بہترین زادِراہ ہیں۔
☆ مروت یہ ہے کہ جب وعدہ کرے' تو پورا کرے۔
☆ نیک لوگ اپنے انجام سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔
☆ اللہ کی جنت دنیا میں دیکھنا ہو تو ماں کی گود میں سو کر دیکھو۔
☆ ظالم کے خلاف جتنی دیر سے اُٹھو گے' اتنی ہی زیادہ قربانی دینی پڑے گی۔

oOo

بلال احمد ڈار
ریسرچ اسکالر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد-500032 (تلنگانہ)

مولانا شبلی بحیثیت سوانح نگار

سوانح عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ظاہر ہونے والا، پیش آنے والا اور ماجرا کے ہیں۔ سوانح عمری کا مطلب ہے واقعاتِ حیات، حالاتِ زندگی یا زندگی کی سرگزشت جس میں ہر طرح کے نرم گرم، اچھے بُرے اور تلخ و شریں واقعات شامل ہیں۔ انگریزی میں سوانح کے لیے Biography کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے معنٰی رودادِ زندگی تحریر کرنا ہے۔ اپنی زندگی کے بارے میں لکھنا آپ بیتی کہلاتا ہے اور دوسروں کے بارے میں لکھنا سوانح نگاری کہلاتا ہے۔ سوانح نگاری کا فن بڑا ہی مشکل، دشوار اور نازک فن ہے۔ اس میں کسی شخصیت کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی ایسی تصویر کشی کی جاتی ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہو اور یہ واقعات قارئین کے لیے پُرکشش ہوں۔ اس میں لکھنے کا جو انداز اپنایا جاتا ہے وہ قاری کے لیے دلکش اور پُرکشش ہو۔ کسی شخصیت کے بارے میں لکھنا، زندگی کے حالات مرتب کرنا اور اس سے عہدہ برآ ہونا آسان کام نہیں ہوتا اور کسی نے لکھا ہے کہ یہ اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا تلوار کی دھار پر چل کر با سلامت پار ہو جانا۔ مختصراً یہ کہ فن سوانح نگاری ایک شعوری مگر تخلیقی عمل ہے۔ سوانح نگار کو موضوع کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور اس کے حدود کا تعین کرنا پرتا ہے۔ جس شخص کے بارے میں لکھنا ہو اس کے بارے میں پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام واقعات اور کارناموں کو ترتیب دینا اور قاری کے سامنے پیش کرنا سوانح نگار کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔ سوانح میں ہیرو کی ذہنی کیفیت تک پہنچ کر اس کو ٹٹولنا اور اس کی شخصیت کے اُتار چڑھاؤ کو گرفت میں لینا ایک اچھے سوانح نگار کا بنیادی فرض ہے۔ سوانح نگار ایک خاص حسنِ ترتیب سے اہم واقعات کو اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقیوم فن سوانح نگاری کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''سوانح میں اپنے دور کی تاریخی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی کشمکش کا اظہار ہوتا ہے۔ بغیر اس کے کوئی سوانح مکمل نہیں ہوسکتی کیوں کہ ہیرو جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اس کے اثرات اس کی زندگی پر حاوی

ہوتے ہیں۔اس لیے کسی فرد کی سیرت اور ذہنی ارتقاء بغیر اس دور کی تمدنی زندگی کے نہیں سمجھا جا سکتا۔لیکن یہاں بھی وہی باتیں کرنا چاہیے جو ہیرو کی زندگی سے براہِ راست تعلق رکھتی ہوں۔تاریخی و سماجی پس منظر اس حد تک ہونا چاہیے کہ ہیرو کے کردار پر روشنی پڑ سکے۔محض تمدنی زندگی کی آئینہ داری بائیوگرافی کا موضوع نہیں ہوتی۔ایک اچھی سوانح میں یہ پس منظر اس طرح ملا جلا نظر آنا چاہیے کہ نہ تو شخصیت اس میں چھپ کر رہ جائے اور نہ محض شخصیت ہی کا غلبہ رہے۔'' (سوانح نگاری کیا ہے از ڈاکٹر عبدالقیوم، مشمولہ اردو ادب کی فنی تاریخ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور 2003،ص:319)

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ سوانح نگاری ادب کی وہ صنف ہے جو کسی خاص فرد کی زندگی کا عکس پیدائش سے موت تک پیش کرتی ہے۔ اس کی تمام تر کامیابیوں، کارناموں اور زندگی کے اہم واقعات و کیفیات کو دلچسپ انداز میں اجاگر کرتی ہے۔سوانح نگاری کسی انسان کی زندگی کی پوری یا جزوی تاریخ ہوتی ہے۔

اردو میں جہاں تک سوانح نگاری کا تعلق ہے تو اس کے ابتدائی نقوش دکنی مثنویوں میں مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد اردو شاعروں کے جو تذکرے لکھے گئے ان میں بھی سوانحی عناصر کی آمیزش مل جاتی ہے۔لیکن اردو ادب میں باقاعدہ سوانح نگاری کی ابتداء مولانا حالی نے حیاتِ سعدی لکھ کر کی۔ یہ سوانح حالؔی نے 1886ء میں قلمبند کی۔اس کے بعد انہوں نے دو اور سوانح عمریاں یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید تحریر کیں جن میں غالب اور سرسید کی زندگی کے مختلف گوشوں اور کارناموں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔مولانا حالؔی کے بعد اردو سوانح نگاری میں جو نام سرفہرست نظر آتا ہے وہ مولانا شبلؔی ہے جو کارلائل سے بے حد متاثر تھے۔ ہمارا مقصد یہاں شبلؔی بحیثیت سوانح نگار پیش کرنا ہے لہٰذا ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کا مختصر سا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مولانا شبلی نعمانی اردو کی مایہ ناز علمی و ادبی شخصیات میں سے ایک ہیں جو سوانح نگاری میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی پیدائش اعظم گڈھ کے ایک گاؤں بندول میں 1857ء میں ہوئی جو سیاسی اور سماجی اعتبار سے پُر آشوب دور تھا۔مولانا شبلؔی جب علی گڈھ گئے تو انھوں نے سرسید سے ملاقات کی اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔یہیں سے شبلؔی نے تحقیق وتنقید کا کام شروع کیا اور مختلف ممالک کی سیر کی۔1898ء میں ملازمت ترک کر کے اعظم گڈھ چلے آئے۔1913ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔مولانا شبلی کی مشہور تصانیف میں الفاروق، سوانح مولانا روم،علم الکلام،موازنہ انیس و دبیر، مقالات شبلی، المامون،شعرالعجم،سیرت النعمان،سیرت النبی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا شبلی کی شخصیت متنوع پہلوؤں کی حامل تھی۔ ان کا ذوق کافی وسیع تھا۔مختلف موضوعات پر انھوں نے قلم اُٹھایا ہے اور اپنی علمی استعداد سے موضوع کے ساتھ پورا حق ادا کر دیا۔ان کی تصانیف کی سب سے

بڑی خوبی وخصوصیت فلسفیانہ تحقیق و استدلال ہے۔ان میں شبلی نے عام فہمی کا خیال ملحوظ خاطر رکھا ہے۔شبلی بہ یک وقت شاعر، محقق، مورخ، فلسفی ، ناقد ، ماہر تعلیم، مجدد، محدث، واعظ، اخبار نویس ،مکتوب نگار وغیرہ کی حیثیت سے کافی شہرت ومقبولیت حاصل کر چکے ہیں لیکن سیرت و سوانح نگاری سے انھیں خاص شغف اور دلی لگاؤ تھا۔سوانح نگاری میں شبلی کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ان کی رائے میں خوش اعتقادی سوانح عمری کے محاسن پر پانی پھیر دیتی ہے۔شبلی اس خیال کے قائل ہے کہ جس شخص کے عام لوگ عقیدت مند ہوں گے ان کی سوانح عمری لکھنا نہایت نازک کام ہے۔جس شخص کی سوانح عمری لکھنی ہو صداقت اور سچائی سے واقعات کی چھان بین کرنی چاہیے۔مولانا شبلی سوانح عمری کے ہیرو کے وہ اوصاف وخصائل ظاہر کرتے ہیں جن میں انسانی فطرت کی جھلک نظر آتی ہے۔سوانح نگاری میں شبلی نے تصویر کے دونوں رخ پیش کرنے کو بڑی اہمیت دی اور ان کے نزدیک سوانح کا بڑا مقصد اصلاحِ اخلاق ہے اور ان کی رائے میں یہی طریقہ سب سے صحیح ہے۔مولانا شبلی نے جو سوانح عمریاں لکھی ہیں ان میں کچھ علمی شخصیتوں پر لکھی گئی، کچھ تاریخی شخصیتوں پر اور ایک پیغمبر اسلام حضور اقدسؐ جیسی عظیم ذات پر لکھی گئی ہے۔علمی شخصیتوں کی سوانح عمریوں میں سیرۃ النعمان، الغزالی، سوانح مولانا روم شامل ہیں۔تاریخی شخصیتوں کی سوانح عمریوں میں المامون، الفاروق شامل ہیں اور سیرت النبی حضورؐ کی ذاتِ مبارک پر لکھی ہوئی سوانح عمری ہے۔یہ تقسیم بعض وجوہات سے غیر علمی ہو جاتی ہے۔ان میں ایک حصہ صریحاً تاریخ نگاری کے حدود میں داخل ہو گیا ہے۔اس کے علاوہ سیرت النبی سوانح نگاری کی جدا شاخ ہے۔مولانا شبلی کی چند سوانح عمریوں کا تذکرہ نیچے کیا جا رہا ہے۔

المامون مولانا شبلی نعمانی کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے جو 1888ء میں منظر عام پر آئی۔یہ کتاب مولانا شبلی نے علی گڑھ کالج کے زمانۂ ملازمت میں لکھی اور یہ کالج کی طرف سے ہی چھپ کر آ گئی۔اس کتاب میں شبلی نے عباسی خلیفہ مامون الرشید کی سوانح لکھی جو سوانح سے بڑھ کر عہد متعلقہ کی تہذیبی و تمدنی دستاویزات ثابت ہوئی۔اس کتاب پر سرسید کے اثرات نمایاں ہیں اور اس کا دیباچہ سرسید کا ہی لکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے اچھی تاریخ اور اچھی سوانح عمری کے اوصاف بیان کئے ہیں۔یہ سوانح دو حصوں میں منقسم ہے۔ایک حصے میں خلافت کا سلسلۂ مامون کی تعلیم و تربیت ولی عہدی ،تخت نشینی ، خانہ جنگیاں ،فتوحاتِ ملکی ، بغداد کی تہذیب وثقافت تک کا حال مذکور ہے۔دوسرے حصے میں سلطنت کے انتظام،آمدنی کے زرائع، فوجی انتظامات، عدالتی کاروائیاں، ہارون کی خلوت وجلوت وغیرہ کا بیان ہوا ہے۔المامون اردو میں پہلی سوانح عمری ہے جس میں جدید معیار و مذاق کے مطابق تاریخی و سوانحی عناصر یکجا کر کے پیش کئے گئے ہیں۔المامون بظاہر ایک سوانح عمری ہے لیکن اس میں بھی شبلی کا سوانحی انداز تاریخی انداز سے بہت متاثر ہے، اسی لیے المامون کے بارے میں کہا گیا

ہے کہ وہ نہ تو مکمل تاریخ ہے، نہ قطعاً سوانح ہے۔اس میں شبلی نے فن سے زیادہ مقصد کو پیش نظر رکھا ہے۔اس کتاب کے مطالعے کے بعد لگتا ہے کہ شبلی مامون کی شخصی کمزوریوں سے زیادہ اُن کارناموں کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو ہیرو کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔شبلی کے نزدیک المامون فضل وکمال کا پیکر تھا لیکن ان خوبیوں کے ساتھ شخصی حکومت کے اقتدار میں بعض ایسی بے اعتدالیاں بھی سرزد ہو جاتی ہیں جن کا خیال کرنے سے دل کانپ جاتا ہے اور دفعتاً اس کی خوبیاں آنکھوں سے چھپ جاتی ہیں۔شبلی فرماتے ہیں کہ مامون کی سب سے بڑی کمزوری اس کی حد سے بڑھی ہوئی فیاضی تھی اور اس پر ہم کچھ الزام لگا سکتے ہیں تو یہی اس کا رحم وانصاف اعتدال کی حد سے متجاوز تھا۔یہ حقیقت ہے کہ مامون پر قلم اُٹھانے کے لیے شبلی کا مدعا اسلامی تاریخ کے اُس عہد زرّیں کو پیش کرنا تھا جو خوشحالی مادی ترقی اور آزاد خیالی کے لحاظ سے دورِ حاضر کا ہمسر نظر آتا ہے۔اپنے اس مقصد میں شبلی نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ اس کے نتیجہ میں اردو ادب کو ایک شاہکار سوانحی تصنیف بھی میسر آ گئی۔

سیرۃ النعمان 1891ء میں حضرت امام ابوحنیفہ کی زندگی پر لکھی گئی سوانح ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔مولانا شبلی کو ان کی ذات سے بہت زیادہ عقیدت و محبت تھی اور اسی عقیدت اور محبت نے شبلی کو ان کی سوانح لکھنے کے لیے مجبور کیا۔شبلی نے اس میں فن کے تقاضوں کا پورا خیال رکھا۔مکمل اور صحیح سوانح اور بائیوگرافی کے لیے جن اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کا بار بار اعلان کیا ہے اور کسی حد تک ان پر عمل پیرا ہونے کی بھی کوشش کی ہے۔سوانح نگار کو سوانح تحریر کرتے وقت صرف خوبیوں کو ہی اجاگر نہیں کرنا چاہیے بلکہ صاحب سوانح کی کمزوریوں کو بھی بے نقاب کرنا چاہیے۔بڑی ہستیوں کو سوانح نگاری میں اس طرح ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ وہ فرشتے معلوم ہوں بلکہ بشری صفات وکمالات میں جو ہو سکتے ہیں انہی کو بیان کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کے اندر سوانح عمری کو پڑھ کر صاحب سوانح کی صفات وخوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے۔صاحب سوانح کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی پردہ پوشی سوانح نگار کی صداقت اور سچائی کو مشکوک کر سکتی ہے۔سیرۃ النعمان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مولانا شبلی نے ایک اچھے حق پسند نبض شناس مورخ کی طرح کہیں بھی سچائی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔مولانا شبلی کو ابوحنیفہ سے محبت وعقیدت تھی تو اس کے باوجود بھی وہ ان کی بے وجہ تعریف نہیں کرتے۔شبلی نے ابوحنیفہ کی بشری کمزوریوں اور مناظرات میں اور ادعا اور جوش مقابلہ کے اثر کا ذکر بھی کیا ہے اور اسے امام موصوف کی تواضع اور بے نفسی کے خلاف قرار دیا اور ان بشری کمزوریوں کی بابت کھلے لفظوں میں یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ انسانی جذبات ہیں جن سے کوئی بری نہیں ہوسکتا۔سیرۃ النعمان کی جامعیت پر ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں:

''ہمارے خیال میں سیرۃ النعمان اس موضوع پر بہترین کتاب ہے اس میں انہوں نے محبت اور عقیدت

کے باوجود امام حنیفہ کی صحیح تصویر پیش کی ہے، حضرت امام کی لائف کی جزئیات فراہم کرنے میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ محنت اور جان فشانی سے کام لیا ہے بلکہ ان کی زینت میں بڑی کاری گری اور صناعی کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔'' (سیرۃ النعمان جلد اول شبلی نعمانی دارالمصنفین اعظم گڑھ، ص:94)

غرض سوانح عمری کے اعتبار سے سیرۃ النعمان ایک بہترین کتاب ہے جس کا اندازِ بیان منفرد اور بے مثال ہے۔ اس میں صاحب سوانح کی صحیح اور جامع تصویر کشی کی گئی ہے۔

الفاروق مولانا شبلی کی تیسری سوانحی کتاب ہے جو علی گڑھ کالج سے فراغت کے بعد 1899ء میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں شبلی نے کہا تھا کہ میں اپنی تصنیفات میں الفاروق کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اس کتاب میں حضورﷺ کے قریبی جانثار حضرت عمر فاروقؓ کی بلند پایہ شخصیت، پاکیزہ سیرت اور ان کے اعلیٰ طرز حکومت کا تذکرہ احسن طریقے سے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب شبلی نے دو حصوں میں تقسیم کی ہے۔ پہلے حصے میں عمر فاروقؓ کی زندگی کے واقعات درج ہیں اور دوسرے حصے میں ان کے کارناموں، ان کے عہد خلافت کی انتظامی، تمدنی اور معاشرتی خصوصیات ہیں۔ حضرت عمرؓ پر اردو فارسی، عربی اور دوسری زبانوں میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن شبلی کی 'الفاروق' ایک منفرد اور بے مثال کتاب ہے۔ شبلی نے اس کو مرتب کرنے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ روم، شام اور مصر کے کتب خانوں کو بھی چھان مارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ کتاب کافی مقبول ہوگئی اور خود شبلی کو اس کتاب پر بڑا ناز تھا۔ اگر شبلی 'الفاروق' کے سوا دوسری سوانح نہ لکھتے تب بھی ان کی شہرت ومقبولیت برقرار رہتی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول 'الفاروق' میں شبلی نے اصولِ صداقت کو برتنے میں کمالِ احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے۔ جتنی زیادہ احتیاط شبلی نے اس سوانح کو مرتب دینے میں برتی شاید کسی اور کتاب میں ملحوظ رکھی ہو۔ شبلی کی اس کتاب کو تاریخ وادب کا اتحاد بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس میں رزم ہو یا بزم، فتح ہو یا شکست، مالِ غنیمت کی تقسیم ہو یا ذمیوں کے حقوق اور مسلمانوں کے باہمی معاملات تمام تفصیلات کی مرقع آرائی شبلی نے اس انداز سے کی ہے کہ پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

الغزالی مولانا شبلی نے 1901ء میں حیدرآباد میں لکھی ہے۔ یہ کتاب امام غزالی کی سوانح عمری ہے جس کو شبلی نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں امام غزالیؒ کے حالاتِ زندگی، تعلیم وتربیت، درس وتدریس، سلطانِ وقت کے دربار میں اعلیٰ منصب، حاسدوں کی ریشہ دوانیاں اور اس عہد کے ملکی حالات کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں امام غزالی کی تصنیفات اور ان پر تبصرہ وتنقید ہے جس سے امام غزالیؒ کے علم تصوف، علم کلام اور علم اخلاق پر روشنی پڑتی ہے۔ شبلی نعمانی نے 'الغزالی' میں امام غزالی کے عہد کے تعلیمی طریقے، نیشاپور کی علمی حالت، سلطانِ وقت

کے دربار میں، خاندان، سلجوقیہ، ملک کا امن وامان، اس عہد کی ملکی حالت اور نظام الملک کے زمانے میں مصارف تعلیم وغیرہ عناوین کے تحت جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر امام غزالی کے عہد کے خراسان کی قاری کی آنکھوں میں ایک تصویر کھنچ جاتی ہے۔مولانا شبلی نے امام غزالی کی زندگی کے بارے میں بھی دوسری سوانح عمریوں کی طرح صداقت اور سچائی کا خاص خیال رکھا اور پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی بات قاری کے سامنے پیش کی۔

سوانح مولانا روم مولانا جلال الدین رومی کی یہ سوانح عمری مولانا شبلی نے حیدرآباد کے قیام کے زمانے میں 1904ء میں مکمل کی تھی مگر یہ پہلی مرتبہ 1906ء میں شائع ہوئی۔اس وقت شبلی ندوہ کی خدمت انجام دینے کے لیے لکھنو میں قیام پذیر تھے۔سوانح مولانا روم میں سلاطین روم اور مولانا کے معاصرین، ارباب صحبت، مولانا کی ولادت کے زیر عنوان اس زمانے کے متعلق کافی اہم جانکاری اور معلومات فراہم کی ہے۔اس زمانے کے دمشق کے بارے میں مولانا شبلی یوں رقمطراز ہیں:

''اس زمانے میں دمشق اور حلب علوم وفنون کے مرکز تھے، ابن جبیر نے 578 میں جب دمشق کا سفر کیا تو خاص شہر میں 20 بڑے بڑے دارالعلوم موجود تھے۔ حلب میں سلطان صلاح الدین کے بیٹے الملک الظاہر نے قاضی ابو الحاسن کی تحریک سے 591 میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کیے چنانچہ اس زمانے سے حلب دمشق کی طرح دینۃ العلوم بن گیا۔'' (سوانح مولانا روم ایڈیشن 2003،ص:5)

مولانا شبلی کی اس کتاب کو زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہوسکی اور اس پر سخت تنقید کی گئی۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے محض سوانح عمری کی حیثیت سے علامہ شبلی کی ناقص ترین کتاب قرار دیا ہے۔مولانا روم کے متعلق معلومات کی عدم دستیابی کے باعث مولانا شبلی ان کے بارے میں تفصیل سے لکھنے سے قاصر رہے۔مولانا روم کے اخلاق و عادات اس تفصیل سے تذکرہ نویسوں نے نہیں لکھے کہ ترتیب سے الگ الگ عنوان قائم کئے جاتے۔یہی وجہ ہے کہ شبلی کو جستہ جستہ جن باتوں کا پتہ چلا ہے انھیں بلاترتیب لکھ ڈالا۔

سیرۃ النبی مولانا شبلی کی سیرت وسوانح کی ایک بہترین کتاب ہے جس میں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ذات وصفات کو موضوع بنایا گیا ہے۔مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے جو والہانہ عقیدت وانسیت ہے اس کی بنا پر ہر زمانے اور ہر دور میں حضور ﷺ کی زندگی اور ان کی سیرت محبوب اور پسندیدہ موضوع رہا ہے۔اس موضوع پر بڑے بڑے مسلم اور غیر مسلم مفکروں، دانشوروں، علما اور مؤرخین کی ایک بڑی تعداد نے اپنی معلومات کی فراہمی کے بہ نسبت سیرت نبوی پر طبع آزمائی کی۔شبلی نعمانی ان تصانیف کو شاید قابل اعتنا نہیں گردانتے تھے اور خود فرماتے ہیں:

''سوانح عمری ایسی لکھنی چاہیے جس سے صاحب سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے، لیکن ہم مسلمانوں کے

دلوں میں سرور کائناتﷺ کی عقیدت کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب اس کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتی، اس لیے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے معیار پر پوری اُتر سکتی ہے''۔(حیاتِ شبلی، علامہ سید سلیمان ندوی، ص:701)

یہ کتاب شبلی کی حضورﷺ سے والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار ہے۔ یہ کتاب اپنی مکمل صورت میں سیرت کے موضوع سے نکل کر اسلام کی صداقت اور حقانیت کے موضوع پر ایک کتاب بن گئی ہے تاہم اس کا سوانحی حصہ اپنی جگہ مکمل اور مفصل ہے۔ اس میں بنیادی طور پر ایک عاشق رسولؐ نے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے اور اس میں عشق ومحبت کا وہی رنگ ہے جو سرسید احمد خان کی 'خطباتِ احمدیہ' میں نظر آتا ہے۔ سیرت النبیؐ کو تالیف کرنے کے سلسلے میں مولانا شبلی کا جو سب سے بڑا مقصد تھا وہ انہوں نے یوں بیان کیا ہے:

''یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں بلکہ علمی ضرورت ہے۔ ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ ہے کہ مجموعہ ضروریات دینی ودنیوی ہے۔''(نفس مصدر، ص:6)

علامہ شبلی نے اپنی اس کتاب میں عہد رسالت کے تمام واقعات و حالات کا جائزہ لیا ہے اور خصوصاً حضورﷺ کے ذاتی حالات وسوانح اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے تمام گوشوں کو اس طرح قلمبند کیا ہے کہ نبیؐ کی زندگی کا ہر پہلو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آ گیا بلکہ نبیﷺ کے عہد کا معاشرہ بھی قاری کے سامنے آ گیا۔ یہ کتاب صرف عام واقعات پر ہی مشتمل نہیں بلکہ خود شبلی کے بقول ''دائرۃ المعارف النبوۃ'' یعنی سیرت کی انسائکلو پیڈیا ہے۔ اس میں نبیؐ کی سوانح حیات کو جدید اصولوں کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔ الغرض سیرت النبی شبلی کی تمام سوانحی کارناموں کی معراج ہے۔

علامہ شبلی نے سوانح نگاری کا معیار کافی بلند کیا اور آنے والے سوانح نگاروں کے لیے نقوش فراہم کئے۔ ان کے یہاں سوانح عمریوں کی غرض وغایت اخلاقی ہے۔ شبلی کی شخصیت متنوع خصوصیات کی حامل تھی۔ عربی، فارسی اور اردو میں انہیں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے ہر قسم کے موضوع پر قلم اُٹھایا۔ خاص طور پر مختلف شخصیات پر انہوں نے جو سوانح عمریاں مرتب کی ہیں ان کی وجہ سے وہ اردو ادب میں بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سوانح نگاری کے لیے جو انہوں نے سب سے پہلا اصول مرتب کیا تھا کہ سوانح نگار یا مورخ جس عہد کے فرد کی سوانح رقم کر رہا ہے اس عہد کے تمام حالات وواقعات رقم کرے تاکہ متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر قاری کے سامنے آجائے۔ جہاں تک مولانا شبلی کی سوانح عمریوں، الفاروق، الغزالی، سیرۃ النعمان، سوانح مولانا روم، سیرۃ النبی کا تعلق ہے' انہوں نے ان تمام سوانح عمریوں کو اس اصول کے مطابق برتا ہے۔ مولانا شبلی ایک کامیاب سوانح نگار کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں جو رہتی دنیا تک اپنی ان سوانح عمریوں کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے۔

☆☆☆

نظیر احمد گنائی
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی
مکان نمبر 451، گلی نمبر 9
وزیر آباد، رام گھاٹ، دہلی 110084

پروفیسر یوسف سرمست کی تنقید نگاری کا مجموعی جائزہ

پروفیسر یوسف سرمست بحیثیت محقق و ناقد سے اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تحقیقی و تنقیدی تصانیف اردو ادب میں اعتبار حاصل کر چکی ہیں۔ خصوصاً تنقید نگاری میں انہوں نے ایک منفرد اور غیر معمولی انداز نقد اختیار کر کے اپنے مخصوص اسلوب اور زبان و بیان میں ادب پاروں کی تقسیم کی ہے۔ انہوں نے شعر و ادب کو پڑھ کر قدیم وجدید کو نئے اردو پرانے تقاضوں کے تحت جانچا اور پرکھا اور اپنی تحقیقی و تنقیدی تصانیف میں اپنے نقطہ نظر کو عملی تنقید کے ذریعہ پیش بھی کیا ہے۔ ان کی تحقیقی و تنقیدی تصانیف میں ''عرفانِ نظر''، ''ادب۔ نقد و حیات''، ''پریم چند کی ناول نگاری''، ''ادب کی ماہیئت، منصب اور تعریف''، تحقیق و تنقید''، ''نظری اور عملی تنقید''، ''دکنی ادب کی مختصر تاریخ''، ''ادب کا نوبل انعام ادبی یا سیاسی اور دوسرے مضامین''، ''اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کی انفرادیت'' اور ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' اردو ادب میں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

پروفیسر یوسف سرمست کی ولادت ۲۸/ دسمبر ۱۹۳۶ء میں بشیر باغ حیدرآباد میں ہوئی۔ یوسف سرمست کا اصل نام یوسف شریف الدین ہے۔ یوسف سرمست نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ بعد میں مدرسہ، پھر اسکول گئے۔ اس کے بعد سٹی کالج میں داخلہ لیا اور اچھے نمبرات سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کامیاب کیا۔ پھر سٹی کالج سے بی۔اے پاس کیا۔ اس کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے منسلک ہوئے۔ یہاں انہوں نے ایم۔اے اردو کی ڈگری امتیازی نمبرات سے حاصل کی۔ پھر اسی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی سند بھی لی۔ اس طرح سے بحیثیت لکچرر وہ اسی شعبہ سے وابستہ ہوئے اور درس و تدریس میں مشغول رہے۔ لکچرر سے ترقی کرتے ہوئے پروفیسر ہوئے۔ بحیثیت استاد انہوں نے کئی طالب علموں کی بہترین رہنمائی کی۔ وہ نرم دل، محبی و مشفق استاد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے طالب علموں کو محبت سے پڑھاتے تھے۔ بلکہ انہیں آگے بڑھنے کی تربیت بھی کرتے تھے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر میمونہ مسعود کہتی ہیں:

''پروفیسر یوسف سرمست ایک نرم دل، خوش مزاج اور شریف النفس انسان ہیں۔ وہ نرم لہجے میں ہر وقت باتیں کرتے ہیں۔ وہ کلاس میں اکثر ہم لوگوں کو

نصاب کے علاوہ نئی معلومات سے آگاہ کرتے تھے۔انہوں نے ہمیشہ شاگردوں کی قدر کی ہے اور اپنے آگے چلانے کی راہیں بنائی ہیں۔''

حوالہ:شخصیت انٹرویو، ڈاکٹر میمونہ مسعود،عثمانیہ یونیورسٹی آف حیدرآباد، تاریخ ۹ مئی ۲۰۱۷ء

پروفیسر یوسف سرمست دور حاضر کے ایسے نقاد ہیں جنہوں نے دورانِ تحقیق ادب پاروں کو صحیح نگاہ سے دیکھ کر غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ وہ جب کسی مسئلے کو پیش کرتے ہیں تو وہ مسئلے کی تہہ تک جا کر اس کا حل بھی تلاش کر کے پیش کرتے ہیں۔ ادب میں زبان ایسی استعمال کی جاتی ہے جو بیک وقت کسی بات کو ظاہر بھی کرتی ہے اور چھپاتی بھی ہے۔ کیوں کہ زبان اور خاص طور پر ادبی زبان استعاراتی ہوتی ہے۔ادبی زبان میں جذبات واحساسات کو متاثر کرنے کی صلاحیت اور قوت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ادب کی تفہیم کے لیے تاثراتی و جمالیاتی پہلوؤں کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ تاکہ ادیب یا شاعر کے ادبی کیفیات تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی یہی تاثرات ہوتے ہیں۔

اپنی نظری تنقید میں وہ ادب میں تخیل کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ان کے مطابق انسان کی باطنی زندگی یعنی اس کے جذبات و احساسات کی پیش کشی کے لیے فن کار کو تخیل سے کام لینا پڑتا ہے۔ انہوں نے اپنی تنقید میں تحقیق اور تنقید کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ ان کے نزدیک تحقیق اور تنقید کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ انہوں نے تحقیق وتنقید کی مختلف تعریفیں پیش کرتے ہوئے ان کے آپسی رشتے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یوسف سرمست جب ادب میں شدت تاثر کے اظہار کو ضروری خیال کرتے ہیں وہیں وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ ادب میں زندگی کی عکاسی بھی ضروری ہے۔انہوں نے ادب کے زندگی سے اٹوٹ رشتے پر بار ہا زور دیا ہے۔ وہ ادب کے مطالعے میں اس بات کے بھی قائل نظر آتے ہیں کہ ادب میں ادیب کا عہد اور اس کے عہد کے معاشرتی، سیاسی وتہذیبی حالات کی عکاسی بھی ضروری ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ادب کے مطالعے میں نفسیاتی تجزیے کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔نفسیاتی تجزیے سے مراد ان کے نزدیک تحلیل نفسی نہیں ہے بلکہ واقعات اور کرداروں کا ایسا بیان ہے جس سے نفسیاتی محرکات کی طرف ہمارا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں سے ان کے انداز نقد کا پتہ ملتا ہے یعنی وہ کسی ایک چیز پر اصرار نہیں کرتے بلکہ ادب کے مطالعے کے لیے جتنے پہلو ممکن ہو سکتے ہیں' ان کو استعمال کرنے پر زور دیتے ہیں۔

غرض نظریاتی تنقید میں وہ ادب کے جمالیاتی پہلوؤں کی تلاش وجستجو کے ساتھ ساتھ تاثرات کے شدت سے اظہار کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ساتھ ہی وہ مصنف کے عہد، اس کے نفی اثرات، اس کے عہد کے حالات اور ماحول کے علاوہ تہذیبی واخلاقی قدروں پر بھی زور دیتے ہیں۔علاوہ ازیں انہوں نے نفسیاتی عوامل کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔

یوسف سرمست کے یہاں عملی تنقید کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ اصناف ادب پر عملی تنقید کی ہے۔ شعراء ادیبوں اور ادب کی مختلف تحریکوں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس سلسلے میں ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' ان کی اہم کتاب ہے۔ جو اردو ناول نگاری کی تاریخ کے سلسلے میں اہمیت رکھتی ہے لیکن صنف ناول کے بارے میں بھی جگہ جگہ اس میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ناول کے تعلق سے پروفیسر یوسف سرمست کا یہ ماننا ہے کہ ناول مغرب سے برآمد کی ہوئی صنف نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے مخصوص حالات کی بنا پر یہاں مروج ہوئی ہے۔ اس بات کو وہ یوں ظاہر کرتے ہیں ''اگر چہ ناول کا لفظ اور اس کی ہیئت انگیزی ادب کے ذریعہ ہندوستان آئی لیکن اصل میں ہندوستان کے وہ مخصوص حالات تھے جنہوں نے یہاں کے ادیبوں کو ناول نگاری کی طرف راغب کیا۔''

انہوں نے اس سلسلے میں تفصیل سے بحث کی ہے اور بتایا کہ حقیقت میں یہ ایک ضرورت تھی کہ کیوں کہانی ہر زمانہ کے ادب کی مقبول ترین صنف رہی ہے۔ اس مقبولیت کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے ادیبوں نے زندگی کی حقیقتوں اور اپنے خیالات کو قصوں میں سمونا شروع کیا۔

اسی لیے ادبی پس منظر کے عنوان کے تحت نذیر احمد اور سرشار کی ناول نگاری کا بھی جائزہ لیا ہے۔ انیسویں صدی کے اہم ناول نگاروں میں پہلا نام نذیر احمد کا آتا ہے ویسے تو اردو کے اولین ناول نگار کے تئیں ہمیشہ اختلافات رائے ملتی ہے۔ بعضوں کے نزدیک نذیر احمد اولین ناول نگار ہیں بعض ناقدین سرشار کو اولیت دینے چاہتے ہیں لیکن یوسف سرمست نے اپنی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' میں دلیل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ ''مراۃ العروس'' اردو کا پہلا ناول ہے اور نذیر احمد ہی اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔

انہوں نے ناول کی مختلف اقسام پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اردو ناولوں سے اس کی مثالیں پیش کرتے ہوئے ان پر بحث بھی کی ہے۔ ناول کے علاوہ انہوں نے صنف افسانہ پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے بعد انشائیہ کے حوالے سے انہوں نے بتایا ہے کہ انشائیہ کا اسلوب اگر چہ شگفتہ، سلیس، سادہ اور نرم و نازک ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود انشائیہ میں فلسفہ، حکمت اور سائنس جیسے موضوعات بھی زیر بحث آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یوسف سرمست کی عملی تنقید میں شعراء اور ادیبوں پر بھی اظہار خیال ملتا ہے۔ شعراء میں ولؔی، میرؔ، مصحفیؔ، غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ، فیضؔ اور مخدومؔ محی الدین کی شاعری پر اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری اور اسلوب کی انفرادیت پر خصوصی بحث کی ہے۔

پروفیسر یوسف سرمست نے کئی نثری اصناف ادب پر تنقیدی رائے پیش کی ہے جیسے ناول، افسانہ، انشائیہ، خاکہ، تبصرہ، خطوط اور مزاح نگاری وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ شاعروں ادیبوں اور محققین و ناقدین کے خیالات پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر یوسف

سرمست نے جن ادیبوں اور نقادوں پر تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ان میں نذیر احمد، پریم چند، کرشن چندر، بیدی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے نام فکشن پر تنقید کے سلسلے میں ملیں گے اس کے علاوہ غیر نثری اصناف پر لکھنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، مرزا غالب، مجتبیٰ حسین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ محققین میں گارساں دتاسی کی تحقیقی خدمات پر اظہار خیال کیا ہے اور ان کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ ناقدین میں الطاف حسین حالی اور کلیم الدین احمد ہیں جن پر انہوں نے تنقید کی ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی تحریکوں پر بھی ان کے تنقیدی آرا ملتی ہیں۔

یوسف سرمست کی تنقید میں وضاحت وصراحت ہے وہ نظریاتی تنقید ہو یا عملی تنقید اپنے مطالعات میں اپنی آرا کو مدلل اور وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ شارب ردولوی نے ایک انٹرویو میں ان کی تنقید نگاری پر اپنی رائے یوں دی ہے:

''یوسف سرمست ایک اعلیٰ پایہ نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ محقق کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ بات کو پوری وضاحت وصراحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔'' بیسویں صدی میں اُردو ناول'' ان کی اہم کتاب ہے جس کے مطالعہ سے انداز ہوتا ہے کہ وہ ناول کے حوالے سے کافی مطالعہ رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ ترقی پسند تحریک کے عظیم نقادوں میں شمار ہوتے ہیں''۔

حوالہ: شخصیت انٹرویو، پروفیسر شارب ردولوی، دوران سیمینار حیدرآباد، ۹ فروری ۲۰۱۷ء

شارب ردولوی کی اس رائے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے ناقدین میں اہمیت رکھتے ہیں لیکن ان کی تحریروں کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کے اچھے عناصر سے متاثر ہیں اور وہ ان کی انتہا پسندی کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے اعتدال پسند ناقدین میں ہم انہیں جگہ دے سکتے ہیں۔

ان کی تنقید کے مجموعی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تنقید میں کسی ایک بات پر اصرار نہیں کرتے بلکہ تنقید کرتے وقت فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کا مطالعہ اعتدال سے کرتے ہیں۔ ان کی تنقید کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ صرف ایک نظریہ کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ادب کے مطالعے کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں ان کی طرف اشارے کرتے ہیں اور انہیں ادب کے مطالعے کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ مغربی اثرات کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے پر بھی اپنی ناراضگی جتاتے ہیں بلکہ وہ ادب میں مشرقی اقدار اور روایات کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں تاثراتی، جمالیاتی، تاریخی وسماجی اور تہذیبی پہلوؤں پر زور ملتا ہے۔ وضاحت وصراحت بھی ان کی تنقید کا خاص وصف ہے۔ غرض معروضی نقطہ نظر سے وہ ادب کے مطالعے پر زور دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید آرا کی روشنی میں ہم انہیں اردو کے سائنٹفک ناقدین میں بجا طور پر جگہ دے سکتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر رفیعہ نسیم
5-7-323
نیو آغا پورہ، حیدرآباد تلنگانہ

ادبی صحافت کے فروغ میں حیدرآبادی خواتین کا حصہ

صحافت عربی زبان کا لفظ ہے جو ''صحیفہ'' سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی کتاب یا رسالے کے ہیں یعنی ایسا مطبوعہ مواد جو مقررہ وقتوں کے بعد شائع ہوتا ہے ''صحافت'' کہلاتا ہے جبکہ انگریزی میں اسے جرنلزم JOURNALISM کہا جاتا ہے۔

اردو صحافت کی تاریخ بہت طویل ہے اردو زبان میں اخبار و رسائل کا سلسلہ بہت پرانا ہے لھذا پریس کے قیام کے بعد متعدد اخبارات و رسائل کا اجراء عمل میں آیا۔

اُردو اخبار دہلی ۔اودھ اخبار 1858۔آگرہ اخبار1863۔اودھ پنچ 1877۔ پیسہ اخبار 1886 وغیرہ قدیم اخبارات و صحافت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ غلامی کی زنجیروں سے جب بیزاری عام ہوتی اور ملک میں سیاسی بیداروں کا آغاز ہوا تو صحافت کو فروغ ہوا۔اور جب خلافت ،سوراج تحریروں کو بھی بڑی مقبولیت ملی ۔وسائل و ذرائع کے کمی کے باوجود اس عہد میں صحافت کے معیار میں بلندی پیدا ہوئی۔ مولانا شبلی ''الندوہ'' مولانا آزاد کے ''الہلال والبلاغ'' مولانا محمد علی جوہر کے ''ہمدرد'' مولانا ظفر علی خان کے زمیندار اور عبدالمجید سالک کے ''انقلاب'' وغیرہ نے اس دور میں محافق نے اپنا اصل مقام حاصل کیا۔

عمومی طور سے اس عہد کی صحافت نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے تاثرات کیے اگر ہم جائزہ لیں تو اس صحافت میں جو قدر مشترک نظر آتی ہے وہ جنگ آزادی کی جدوجہد ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو صحافت نے ملک عزیز کے آزاد کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔عوامی بیداری اور سیاسی شعور کے بیدار کرنے میں اس دور صحافت نے جس قدر اپنا کردار ادا کیا وہ دوسرے تخلیقی عمل سے ممکن نہ ہوسکا۔

اُردو صحافت کا آغاز 1822 سے شروع ہوتا ہے جس نے کٹھن راہوں کا سفر صبر و استقلال سے طے کیا۔اس کی تاریخ داد و رسن کی آزمائش کی داستان ہے اس کا ماضی شاندار اور قابل فخر ہے ۔اُردو صحافت کے میدان میں قدم رکھنے والے سر سے کفن باندھ کر اور جان ہتھیلی پر لے کر آئے تھے اور ہر آزمائش سے سرخ رو ہوتے تھے۔

آزادی کی تمنا کے ساتھ اردو صحافت نے تحریر کی شائستگی تہذیب و آداب کا اونچا معیار قائم کیا ۔ اردو

صحافت اہل قلم کے ذریعہ لوگوں کو سلیس اور شگفتہ زبان سیکھنے کا موقع ملتا تھا' دلوں کو جوڑنے کا کام جس طرح اردو بولی کر رہی تھی وہی کام اردو صحافی کا قلم کر رہا تھا۔

مقدر کی خرابی سے خون آلود آزادی کی بہت بھاری قیمت چکانا پڑی۔ نہ صرف ملک دو ٹکڑے ہوا دلوں کے بھی ہزار ٹکڑے ہوئے ۔انسانیت اور اخوت کی لرزۂ خیز بربادی کے بحران میں اردو صحافت کو ایک مرتبہ پھر کڑے امتحان کا سامنا کرنا پڑا ۔اگر ہم جائزہ لیں تو اردو صحافت نے جس قدر اپنا کردار ادا کیا وہ دوسرے تخلیقی عمل سے ممکن نہ ہو سکا۔

ہندوستان میں اردو صحافت کی ابتداء کا ذکر کیا جائے تو کلکتہ سے 1822 سے شائع ہونے والا اخبار ''جام جہاں نما'' کو مانا جاتا ہے لیکن ''جام جہاں نما'' میں اردو کے ساتھ فارسی کے صفحات بھی شامل ہوتے تھے ۔ لہذا یہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہوتا تھا ۔اس میں پس منظر میں دیکھا جائے تو پہلا خالص اردو اخبار ''اخبار دہلی'' تھا جسے مولوی باقر نے جاری کیا تھا۔ یہ ہندوستانی قوم پرستی کا زبردست حامی تھا۔ 1857ء میں جنگ آزادی میں اس کا اہم کردار تھا۔

حیدرآباد میں اردو صحافت کا آغاز 1855ء سے ہوا۔ 1884ء میں ریاست حیدرآباد کی سرکاری زبان اُردو قرار پانے کے بعد اردو کو کافی فروغ حاصل ہوا۔تبھی سے اردو اخبارات و رسائل جاری ہوئے ۔

1822ء سے 2018 تک اردو صحافت میں کئی نشیب و فراز آئے لیکن 1950ء تک خواتین کی خدمات صحافتی میدان میں کم تھیں' اس کی وجہ خاندانی' سماجی اور مذہبی حد بندیاں تھیں لیکن آزادی کے بعد خواتین اخبارات و رسائل سے جڑی ہوئی ہیں اور اپنے طور پر معاونین کے ساتھ اخبارات و رسائل کا اجراء عمل لاتی رہیں اور حسن و خوبی سے صحافتی فرائض انجام دیتی رہیں۔

حیدرآباد میں خواتین کی ادارت میں شائع ہونے والے رسائل کے تذکرہ سے قبل ''محبت حسین'' کی خدمات کا ذکر ضروری ہے ''محبّ حسین'' حیدرآبادی اردو صحافت کے باوا آدم ہیں ۔انہوں نے سب سے پہلے اردو صحافت کو ایک فن بنایا۔صحافت کو نطق و آہنگ دیا ۔ صحافت کا مزاج بنایا اور روایت بنی' نیا شعور دیا اور انہی کی کوششوں سے حیدرآبادی صحافت کی تاریخ نے ایک نیا موڑ دیا۔انہوں نے خواتین کے لئے حیدرآباد سے رسالہ ''معلم نسواں'' 1894 میں جاری کیا۔محبّ حسن نے اس دور کے جاگیردارانہ ماحول میں اپنے رسالے کی مدد سے ''تحریک حقوقِ نسواں'' کا آغاز کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعہ خواتین کے مسائل اور تعلیم نسواں کی طرف سماج کی توجہ مبذول کرائی جس کے نتیجہ میں خواتین بھی اس اہم کار کی طرف متوجہ ہوئیں ۔اسی رسالہ کی اشاعت نے خود خواتین میں ادبی ذوق کو فروغ دیا اور ان میں تخلیقی اظہار کا حوصلہ پیدا کیا۔اس مضمون میں حیدرآباد سے نکلنے والے رسائل جن کی مدیر خواتین رہی ہیں ان کا تعارف پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ۔ان میں سب

سے پہلا نام ''صغرا ہمایوں مرزا'' کا ملتا ہے۔

النساء: صغرا ہمایوں مرزا نے 1919ء میں ''النساء'' جاری کیا۔ یہ ایک ایسا رسالہ تھا جس میں زیادہ تر خواتین کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کی مدیرہ ایک اصلاحی اور انقلابی شخصیت کی مالک تھیں۔ خواتین کی تعلیم و تربیت اس رسالہ کا خاص کردار تھا۔ خواتین میں تعلیم کو عام کرنے کی تلقین بھی کی گئی تھی۔

داستان:۔ 1947ء میں احمد مکی نے محترمہ زینت ساجدہ کی معاونت میں جاری کیا۔ ''داستان'' ملک گیر مقبولیت کا حامل تھا۔ اسے تمام مشاہیر ادب کی قلمی معاونت حاصل تھی۔

عکس:۔ 1952ء میں محمودہ یاسمین کی ادارت میں گوشہ محل سے جاری ہوا تھا۔ یہ بھی رسالہ نئے ادب کا ترجمان تھا۔ محمودہ یاسمین خود بھی اپنے دور کی اچھی افسانہ نگار تھیں۔ اس لئے ''عکس'' کو بھی افسانے کے ارتقاء کے لئے وقف کر دیا۔ قدیر ظفر جو محمودہ یاسمین کے بھائی تھے' ان کی معاونت حاصل رہی۔

خاتون دکن :۔ صالحہ الطاف حسین کی ادارت میں اختر محبوب صبیحہ سعید۔ رخشاں تحسین۔ عذرا سعید کے تعاون سے نومبر 1962ء میں شائع ہوا۔ خاتون دکن مئی 1963ء کے شمارہ میں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنے مضمون علامہ راشد الخیری کے ناولوں میں عورت کا کردار'' پر ''علامہ راشد الخیری'' کے ناولوں میں عداوت اکثر ابتداء سے انتہاء تک مریم نظر آتی ہے' کہیں زلیخا دکھائی نہیں دیتی۔ یعنی ان کی نظر میں عورت کی فطرت کے ایک ہی رنگ، ایک ہی جلوے اور ایک ہی جہت ہوتی ہے وہ کردار کی نشو و نما پاتے' نئے روپ دھارتے' ہنستے اور سنورتے اور زندگی کے ترنم پر رقص کرتے ہوئے نہیں دکھا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ''راشد الخیری'' کے یہاں عورت کے کردار میں ایک جمود' یکسانیت اور یک رنگی ملتی ہے۔ اس کے باوجود ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ راشد الخیری'' نے اپنے ناولوں میں عورت کے کردار کو پیش کرتے ہوئے بڑی صداقت سے کام لیا ہے۔ ''خاتون دکن رسالے میں''، ''نقش اول کے عنوان سے مستقل اداریے لکھے جاتے رہے اور زبان و ادب کے مسائل پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ اس کے کالم بہت مشہور ہوئے۔

قلم کار:۔ مغل اکیڈمی کی جانب سے احمدی بیگم کی ادارت میں فبروری 1963ء میں نیشنل فائن پرنٹنگ چارکمان حیدرآباد دکن میں طبع ہوکر شائع ہوتا تھا۔ اس پرچہ کی مجلس مشاورت کے اراکین میں پروفیسر ابوظفر، عبدالواحد، رفیعہ سلطانہ جہاں بانو نقدی، راجہ رتنا ریڈی، حکیم تیموری، خاور نوری، سید مہدی حسین شامل تھے۔ شرکاء میں اشرف رفیع اور زینب فیض الدین شامل تھے۔ ''قلم کار'' کے اداریے ''سوجھ بوجھ'' کے مستقل عنوان سے لکھے جاتے رہے۔ ان اداریوں میں اردو زبان کی ترقی اور مستقبل کے بارے میں روشنی ڈالی جاتی رہی۔ ایک اداریہ کا اقتباس نقل ہے۔

''اس وقت صورت حال یہ ہے کہ وہ لوگ بھی

جن کی مادری زبان اردو ہے' اپنی زبان سے اغماز برت رہے ہیں تو بعض ارباب نظر کے اندازے کے مطابق اردو زبان جاننے والوں کا دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے کیونکہ نئی نسل کی تعلیم ۔انگریزی ، ہندی یا تلگو زبان میں ہورہی ہے۔ یہ واقعیت واقعی ایک حزنیہ ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کو اردو زبان میں تعلیم دلانے پر راغب کرنے کی مہم چلائی جائے ۔''قلم کار'' کلاسیکی اقدار کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کی صحت مند رجحانات کا حاصل رسالہ تھا ۔ اس کو ابتداء ہی سے ملک وبیرون ملک کے شعراء وادیب کا تعاون حاصل رہا ۔مغل اکیڈیمی کا یہ ترجمان تقریباً تین یا چار سال تک اردو زبان وادب کی خدمت انجام دیتا رہا۔ بعد میں چند ناگزیر حالات کی وجہ سے یہ بند ہوگیا۔

اکٹوبر ونومبر 1964ء میں خصوصی نمبر شخصیت اور فن ۔طنز ومزاح انشائیہ ،نقد ونظر شائع ہوئے ۔ ڈسمبر، جنوری 1966ء میں خصوصی افسانہ نمبر شائع ہوا۔

شعور:۔ دوماہی رسالہ تھا۔مارچ 1954ء میں شائع ہوا۔ڈاکٹر مغنی تبسم اوراختر جہاں کی ادارت میں نکلا کرتا تھا۔اردو ادب کے مشہور محقق وادیب پروفیسر عبدالقادر سروری اس جریدہ کے مدیر اعزازی تھے ۔ باتصویر تھا اورحسن کاری میں''سرورڈنڈا'' کا عمل تھا۔ ہمارا ڈائجسٹ سائز کا یہ رسالہ جملہ تین شماروں کی اشاعت کے بعد مسدود ہوگیا ۔اس میں مختلف عنوانوں کے تحت اداریے لکھے گئے ۔''آج کی رات'' ''گفت وبرخاست'' اور''میں کیا' زمانہ اگر قدردان'' ہے' اس میں کل ہند ترقی پسند مصنفین کے فیصلوں اور مسائل پر روشنی ڈالی جاتی۔

شعروحکمت کے پہلے شمارہ کی اجرائی جنوری 1970 میں عمل آئی اورروزاول سے ہی اختر جہاں اورمغنی تبسم کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔اس رسالے میں ''ادیب کا سماجی رول'' کے عنوان سے مستقل اداریے شہریار' اور''مغنی تبسم نے لکھے ۔اس کی خصوصیت میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میں''مشرق اورمغرب کے نغمہ'' کے عنوان سے مغربی ادیبوں وشعراء کی تخلیقات کو اردو میں ترجمہ کرکے شائع کیا جاتا رہا۔اس کا نام ''راشد نمبر'' ناگپور اورجموں یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیا گیا۔

''شعروحکمت'' کے عام وخاص شمارے کیفیت وکمیت کے لحاظ سے معیاری ہوتے تھے۔اس کے ہر شمارے کے 384 صفحات ہوا کرتے تھے۔اس کی اولین مدیرہ اختر جہاں تھیں بعد میں مغنی تبسم ،شہریار شامل ہوئے ۔اس طرح سے خواتین نے صحافت کو فروغ وترقی عطا کی۔

سماجی سطح پر ذہنی وفکری تبدیلیوں کے نتیجہ میں پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ الکٹرانک میڈیا میں بھی خواتین آن اسکرین یا آف اسکرین حصہ لے رہی ہیں ۔ اردو صحافت کا مستقبل تابناک ہے ۔کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ کے سہارے وہ بھی دوسری زبانوں کی صحافت کا مقابلہ کررہے ہیں ۔اردو صحافت کے فروغ میں خواتین کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆☆

ڈاکٹر بانو سرتاج
حیدرآباد

ادب اطفال، اہمیت اور تقاضے

ہندی کویکر اعلان کرتا ہے کہ:

"Not the parents,
Not the teachers,
The preachers,
Not even the writers,
But the children themselves
Who determine
What their literature is to be."

صحیح، صد فیصد صحیح! نہ والدین نہ استاذ، نہ مصلح قوم نہ بچوں کے لئے لکھنے والے ادیب، بلکہ خود بچے یہ طے کرتے ہیں کہ ان کا ادب کیسا ہو!

بچوں کی پسند پر ہی بچوں کے ادب کی درجہ بندی ہونی چاہیے، جسے وہ پسند کریں، خوشی خوشی قبول کریں وہ ان کا ادب، جسے پسند نہ کریں وہ ادب اطفال پر، مشکل الفاظ والی محض تُک بندی والی نظمیں خارج، حیرت وتجسس اور ایڈونچر سے بھرپور کہانیاں، قبولیت کے تاج سے سرفراز، نصیحتوں سے بوجھل، بے سر پیر کی کہانیاں، مملکت ادب اطفال سے ملک بدر، سراج انور کہتے ہیں:

''ادب کا ہر وہ صنف جو بچوں کے معصوم دلوں کو اپنی طرف کھینچے، وہ صحیح معنوں میں ان کا ادب ہے۔''

ادب کے نام پر جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ اچھا، کم اچھا یا فضول ہوتا ہے۔ اور اسی بناء پر قبول یا ناقابل قبول ہوتا ہے۔ کم اچھے، بے کار اور بور ادب کو اگر حاشیے پر رکھ دیا جائے تو بچوں کو اچھا ادب دینا ہی بہتر ہے۔ فرانسیسی ادیب 'والٹر ڈیلا مارلے' جب ادب اطفال کی بات کرتا ہے تو صاف صاف کہتا ہے:

''میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ بہترین ادب میں جو زیادہ بہترین ہے اسے ہی ادبِ اطفال سے تعبیر کیا جاسکتا ہے''۔

ادب اطفال کیا ہے؟ بطور خاص بچوں کے لئے لکھا گیا ادب یا بڑوں کے ادب میں سے بچوں کے لئے جو مناسب ہو وہ ادب یا بچوں کے لئے بچوں کا لکھا ہوا ادب؟ یہ بحث کافی وقت مانگتی ہے، مگر مختصر بات کی حقدار تو ہے ہی!

برٹانیکا جونیر انسائیکلو پیڈیا (حصہ چہارم) میں اس تعلق سے کہا گیا ہے:

''ادب اطفال تین طرح کا ہوتا ہے: اولاً وہ کہانیاں جو بطور خاص بچوں (لڑکے لڑکیاں دونوں) کے لئے لکھی گئی ہوں۔ دوم زمانہ قدیم سے چلی آرہی پریوں کی

کہانیاں اورلوک کہانیاں ۔سوم وہ کہانیاں جولکھی تو بڑوں کے لئے گئیں مگر جنہیں بچوں نے اپنالیا''۔

اس تعریف میں اول اوردوم نکتے جوں کے توں قبول مگر تیسرے نکتہ میں یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ بڑوں کے ادب میں سے بچوں کے لئے مناسب ادب کا انتخاب کون کرے گا؟ بڑے یا بچے ؟اگر بڑے کریں تو بچوں کی قبولیت کے بعد ہی ادب اطفال میں ان کا شمار ہو۔(بچے یہ انتخاب کر ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ بڑوں کا ادب نہیں پڑھتے)۔ماہر تعلیم پروفیسر ہمایوں کبیر ادب کی قبولیت کو دو بوتلوں کی مثال سے واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ایک میز پر دو بوتلیں رکھی ہوئی ہیں ۔ایک بوتل کا منہ چھوٹا ہے' وہ خالی ہے۔ دوسری بوتل کا منہ چوڑا ہے' اس میں پانی بھرا ہوا ہے۔ چوڑے منہ کی بوتل کا پانی تنگ منہ والی بوتل میں ڈالنا ہے تو بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے ۔ایسا نہ کیا تو مقصد تو پورا نہیں ہی ہوگا' پانی بھی ضائع ہوگا۔

چوڑے منہ کی بوتل وہ استاد ہے جس کے پاس علم ہے لیکن اگر وہ صحیح طریقہ سے تعلیم نہیں دیتا تو تعلیم کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔بچوں کے ادیب کے پاس بھی بچوں کو دینے کے لئے بہت کچھ ہوتا ہے، وہ دیتا بھی ہے مگر بچوں کی قبولِ صلاحیت سے زیادہ ہو جائے تو خود اس کی تخلیقی صلاحیت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ایک امریکی تنقید نگار نے ادب اطفال پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے:

''یہ ضروری نہیں ہے کہ بچوں کے لئے لکھی گئیں تمام تخلیقات ادب اطفال ہی ہوں۔اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ بڑے جسے ادب اطفال مانتے ہیں وہ بچوں کو پسند آجائے ۔ایسے بھی لوگ ہیں جو ادب اطفال کو بڑوں کے ادب سے آسمان اور بچکانہ پیش کش مانتے ہیں''۔

ادب اطفال کی تخلیق کرتے وقت اس بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ بچہ بڑے انسان کی چھوٹی شکل یا ماڈل نہیں ہے ۔ بچے کے محسوسات بڑوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں ۔ بچوں کی دنیا، بڑوں کی دنیا سے الگ ہوتی ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری موضوع کی مقصدیت اورافادیت کو ادب اطفال کا اہم حصہ مانتے ہوئے کہتے ہیں:

''بچوں کے ادب کا اطلاق صرف ان کتابوں اورتحریروں پر ہی نہیں ہوتا جو کہ خاص طور پر بچوں کے لئے معرض وجود میں آئیں بلکہ ان میں وہ تمام نظمیں ونثر شامل ہوتی ہیں جو کہ بچوں کے لئے موزوں قرار پاتی اوراپنے اندر ادبی شان رکھتی ہیں۔''

ادب اطفال۔تعریف اورمعنی: ادب اطفال کے سرتاج شفیع الدین نیّر ادبِ اطفال کی تعریف کرتے ہوئے واضح طور پر کہتے ہیں:

''ادب اطفال نثر ونظم کا وہ خزانہ ہے' جو خاص طور سے بچوں کے لئے لکھا گیا ہواوراپنی افادیت کے اعتبار سے بچوں کے لئے مناسب ہو'یا یوں سمجھئے کہ جو ادب 5-4 برس کی عمر سے 13-14 برس کی عمر تک کے بچوں کے لئے

لکھا گیا ہواُسے ہم ادب اطفال سے تعبیر کر سکتے ہیں''۔

ادب اطفال کی تخلیق کے لئے بچوں کی نفسیات کا علم ضروری ہے ۔ظاہر ہے کہ جوادب بچوں کی عمر کے مطابق لکھا گیا ہو'ان کی دلچسپی کا ہواُسے ہی وہ قبول کریں گے ۔جو ادب ان کے سر کے اوپر سے جائے گا' صرف نصیحتو ں پر مبنی ہوگا۔ روکھا ، پھیکا،کڑوا ،کسیلا ہوگا وہ رہ جائے گا۔اب یہ بات الگ ہے کہ ان کی دلچسپی بھوت' پریت' پریوں' شہزادوں' راکشسوں' جادوگرینوں کی کہانی میں ہو یا کھیل' ایڈونچر' سائنس' تاریخ یا جغرافیہ میں ہو۔۔ ان کی مرضی ۔۔ان کا ادب'ان کا ہونا چاہئے ۔ہنری کومیگر کا خیال ہے:

''ہم ادب اطفال سے کیا معنی اخذ کرتے ہیں؟ کیا یہ وہی ادب ہے جو خاص طور سے بچو ں کے لئے لکھا گیا جسے پریوں کی عجیب نا قابل یقین کہانیاں ننھی منی نظمیں' اخلاقی اقدار' فرمانبرداری اور مہذب سلوک کی طرف لے جاتی کہانیاں' اسکول اور کھیل کے میدان سے جڑی کہانیاں بلاشبہہ ان سب کو ادب اطفال کہا جاسکتا ہے۔''

ادب اطفال کیسا ہو؟ سچا اور اچھا ہو بس ! سچا ادب اطفال وہ ہے جس کے ذریعہ' ادیب جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ کہہ سکے اور جس سے کہنا چاہتا ہے اس تک پہنچ جائے ۔ادب اطفال کی تخلیق کرتے وقت اکثر ہی ادیب کے سامنے ایسے حالات آجاتے ہیں جب اُسے کہنا پڑتا ہے'

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسا تو نہ تھی!

آسان اور بچکانہ ادب کی تخلیق میں ایسا نہیں ہوتا۔(یا ہوتا ہے؟)

ڈاکٹر ظ۔انصاری کہا کرتے تھے

''میرے دل سے پوچھو تو بچوں کا ادب وہی سب سے اچھا' جسے پڑھ کر بچوں کے باپ دادا بھی لطف لیں جس طرح موسم کے پھل اور تہوار کی جلیبی اور برفی کہ بچے بوڑھے دونوں خوش' مزے کا مزا' غذا کی غذا۔

مختصر یہ کہ وہ ادب جو بچوں میں تجسس وفکر وعمل کو فروغ دے کر زندگی کے حقائق کو سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے ۔بچوں میں محبت' انسانیت' بے غرض خدمت' وطن پرستی وغیرہ کے جذبات پیدا کرتا ہے' مشکلات وآفات سے لڑنا سکھاتا ہے وہ ادب اطفال ہے ۔وہ ادب جو نصابی کتابوں کے خشک اسباق کے برعکس دلچسپ طریقہ سے علم مہیا کراتا ہے وہ ادب اطفال ہے۔

ادب اطفال کی اہمیت:

1951ء میں راج گوپال آچاری نے ایک خط میں پنڈت نہرو کو لکھا تھا 'ملک آزاد ہو چکا ہے۔ بہتر ہے کہ اب آپ ایک کونے میں ادب اطفال کی تخلیق کریں''۔

ان کا منشا تھا کہ آزاد ہندوستان کو ترقی کی راہ پر لے جانے کے لئے بچو ں کی جس سمت میں تربیت کی ضرورت ہے اسے نہر وجی جیسا نفسیات کا ماہر ہی مہیا کرا سکتا تھا(مگر وہ سیاست کی طرف راغب ہو گئے ۔)

بچوں کی کردارسازی میں ادب اطفال کا رول نہایت اہم ہے۔

ادب اطفال کی ضرورت:

رسالہ یو۔ایس۔اے(1994) لکھتا ہے:

''نصاب کے بوجھل اسباق سے جب جی اکتا جاتا ہے تب بچے کو کچھ دلچسپ تفریحی مواد پڑھنے کے لئے دینے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہیں ادب اطفال کی ضرورت قائم ہوتی ہے۔ان ہی لمحوں کے لئے تعمیری اور اصلاحی ادب لکھا جاتا ہے''۔

بچوں کی ضروریات الگ ہوتی ہیں' جذبات الگ ہوتے ہیں اس لئے ان کا ادب بڑوں کے ادب سے الگ ہوجاتا ہے۔ایک ادیب بیک وقت بڑوں اور بچوں کے لئے لکھ سکتا ہے مگر دونوں جگہ اس کا رول الگ ہوتا ہے۔بڑوں کے لئے لکھتے ہوئے وہ بڑا ہی رہتا ہے جب کہ بچوں کے لئے لکھنے میں اسے بچہ بننا پڑتا ہے۔اس دنیا میں جانا ہوتا ہے جہاں بچے نہیں' بچوں کے خیالات جاتے ہیں۔

زیب النساء بچوں کے ادب کی ناقد کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔بچوں کے ادب کی ضرورت کے تعلق سے ان کا کہنا ہے:

''بچے کی تربیت اور ذہنی نشوونما کا پہلا مکتب آغوش مادر کو قرار دیا گیا ہے جہاں بغیر کسی کتاب کے بچے کو ذہنی غذا میسر ہوتی ہے اس کے بعد شفیق استادوں کے سایہ تربیت میں وہ پروان چڑھتا ہے جہاں کان اور آنکھ کی صلاحیتوں کے استعمال کے لئے مشاہدہ کے ساتھ مطالعہ کا عمل شروع ہوتا ہے۔مطالعہ اور اس کے لوازمات بچے کی شخصیت کو نکھارنے اور مکمل بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔''

ادب اطفال کے تقاضے: بڑوں کے لئے لکھنا اتنا ہی آسان ہے جتنا آسان مکھن میں سے بال کھینچنا ہے مگر بچوں کے لئے لکھنا پانی پر کچھ تحریر کرنے جیسا مشکل ہے۔اس کے درج ذیل تقاضے ہیں۔

(1) ادب اطفال کی اہمیت سے واقفیت
(2) بچوں کی نفسیات کا علم
(3) بچوں سے لگاؤ
(4) بچوں کی نگاہوں کی زبان سے آگاہی
(5) تجسس کی اہمیت
(6) حس پذیری
(7) بچوں سے رابطہ

تقاضوں کی تکمیل بھلا ہو تو کیسے ہو؟

(1) ادب اطفال کی اہمیت سے واقفیت ادب اطفال تخلیق کاروں کے لئے بے حد ضروری ہے۔بچوں کے لئے صحت مند اور اچھا ادب وہی تخلیق کرسکتا ہے جو ارسطو کی تعریف پر کھڑا اترتا ہے یعنی:

He, who has a taste for every sort of knowledge, who is curious to learn and is never satisfied,may be justly termed a good and true writer of

children's literature.

وہ ادیب جو ہر طرح کا علم حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہے، جو سیکھنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہے اور علم حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ خواہش کرے، جو کچھ سیکھا اس سے کبھی مطمئن نہ رہے وہی بچوں کا سچا ادیب کہا جاسکتا ہے۔ادب اطفال کی اہمیت اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ وہ بچوں میں درج بالا خصوصیات پیدا کرے۔

(2) بچوں کی نفسیات کا علم بچوں کے لئے لکھنے والے کے لئے ضروری ہے۔بچوں کے جسمانی اور ذہنی فروغ کا مطالعہ نفسیات ادب اطفال کے تحت آتا ہے۔ماہر نفسیات کرو اینڈ کرو (Crow and Crow) کے مطابق:

'Child - Psychology is the scientific - study of the individual from his pre-natal begining through the early stages of his adolescent development.

بچے کی شخصیت کا اس کی پیدائش کے قبل سے بلوغت کے ابتدائی برسوں کا مطالعہ، نفسیات ادب کے تحت آتا ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ ادب اطفال کی تخلیق کے لئے قلم اٹھانے سے پہلے نفسیات کی کتاب کے ورق کھولے جائیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ ادب اطفال کے تحت آتا ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ ادب اطفال کی تخلیق کے لئے قلم اٹھانے سے پہلے نفسیات کی کتاب کے ورق کھولے جائیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ جو بچوں کی نفسیات سے واقف نہیں ہوتا وہ اپنے صفت کے ساتھ انصاف بھی نہیں کرسکتا۔

(3) بچوں سے لگاؤ رکھنا، بچوں میں بچہ بن جانے کی صلاحیت رکھنے والا ہی بچوں کے لئے اچھا لکھ سکتا ہے۔ٹیگور مانتے ہیں:

'He, who lost the child in himself / herself is absolutely, unfit for the great task of writing juvenile literature.

جس نے اپنے اندر کے بچے کو کھو دیا، جو اپنے بچپن کو بھول گیا وہ ادب اطفال جیسے عظیم کام کے لئے قطعی ناموزوں ہے میری مثال دیتی ہوں، میں اکثر ہوائی جہاز سے سفر کرتی ہوں پھر بھی بھولا بھٹکا کوئی پلین میرے شہر سے، میرے گھر کے اوپر سے گذرتا ہے تو میں دوڑ کر اسے دیکھنے جاتی ہوں۔محرم، گنپتی کے باجے گاجے دیکھنے۔سننے کے لئے سب کام چھوڑ چھاڑ کر بھاگتی ہوں۔بچوں سے پہیلیاں پوچھتی ہوں، ان کی اوٹ پٹانگ پہیلیوں کے جواب دیتی ہوں۔ٹرین کے سفر میں ایک مرتبہ ایک آٹھ سالہ بچے سے دوستی ہوگئی۔بولا، ''آنٹی، ایک Puzzle پوچھوں؟

ہری جھنڈی دکھاتے ہی بولا ''گوریلے کے نتھنے اتنے چوڑے کیوں ہوتے ہیں؟'' میں نے ہار مان لی تو بے تحاشا ہنستا ہوا بولا'' اس لئے کہ وہ ہر دم ناک میں انگلی کرتا رہتا ہے۔'' اس کے بعد اس نے لائن لگا دی۔ایک

Puzzle ختم نہ ہوتا تو دوسرا تیار ۔مگر ایک بات تھی ۔۔۔میرے Solve_____Puzzle کر لینے سے وہ کافی مایوس ہوتا تھا۔ میں نے کہا اب میں ایک پزل پوچھتی ہوں ۔۔ Ten is afraid of seven why ?۔وہ چکرا گیا۔ میں نے کہا ''دس (10) ڈرتا ہے کہ کہیں اس کی باری نہ ہو جائے ۔'' کیسی باری؟ ''اس نے آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کہا Ten is afraid of seven because seven ate (eight) nine.

ہم دونوں آج بھی دوست ہیں۔فون پر بات کرتے ہیں۔

(4) بچوں کی نگاہوں کی زبان سے آگاہی بھی ضروری ہوتی ہے ۔بچوں کے لئے لکھنے کے نام پر خوامخواہ کچھ بھی لکھنا ادبی بے ایمانی ہے ۔ایڈیٹرس کے چڑھانے پر فضول تک بندی کرنا دوسروں کی کہانیاں چرا کر اپنے نام سے شائع کرنا' اوٹ پٹانگ ڈرامے لکھنا تو صحیح نہیں ہے ۔بچوں کو اخلاقیات سکھانے' نالج بڑھانے' ان کے لئے دلچسپی کا ادب مہیا کرانے کے لئے وہ سب لکھنا ہے اُس طریقہ سے پیش کرنا ہے جیسا وہ چاہتے ہیں۔ زبان سے نہ کہیں' آنکھوں کی زبان سے ہر بچہ یہی کہتا ہے:

'If I cannot learn the way, you want me to learn, why not you teach me the way, I can learn.

جس طریقہ سے آپ مجھے کچھ سکھانا پڑھانا چاہتے ہیں' اُس طریقہ سے اگر میں سیکھتا پڑھتا نہیں تو آپ مجھے اس طریقہ سے کیوں نہیں سکھاتے پڑھاتے' جس طریقہ سے میں سیکھنا پڑھنا چاہتا ہوں۔ہوگئی بات ختم!

(5) تجسس کی اہمیت زندگی میں ہر جگہ' ہر وقت' ہر ایک کے لئے ہے ۔علم آپ کے پاس چل کر تو آئے گا نہیں ' آپ کو اس تک چل کر جانا ہے اور اس کے لئے ہر نئی چیز ' ہر اچھی چیز' ہر کارآمد چیز کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہنا چاہئے ۔ایک صاحب ہمیشہ سوال پوچھنے کے لئے اپنے بچے کی حوصلہ افزائی کرتے تاکہ اس کی نالج بڑھے ۔ ایک روز باپ بیٹے فرصت سے بیٹھے تھے' بیٹے نے پوچھا' ''ابّا' ٹیلی ویژن کا موجد کون ہے؟''

جواب ملا' نہیں معلوم۔''

اچھا' یہ بتایئے سرسی۔رمن کو نوبل پرائز کب ملا؟

''نہیں معلوم۔''

''ہندوستان میں ریل' سب سے پہلے کہاں تک چلی؟''

''نہیں معلوم۔''

بیٹا خوش ہو کر اپنے کام میں لگ گیا تو باپ نے کہا ''پوچھو' پوچھو! رُک کیوں گئے ؟ پوچھو گے نہیں تو نالج کیسے بڑھے گی؟''

تجسس سے مطلب صرف سوال کرنا نہیں ؟ سوالوں کے جواب حاصل کرنا بھی ہے ۔جیسے رڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) کہتا ہے:

I keep six honest serving men they tought me, all I konw Their names are what and why and when Where and how and who?

(6) حس پذیری یعنی اس بات کا علم ہونا کہ درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو اللہ تعالیٰ نے۔ کہانیوں' نظموں کے ذریعہ بچے کو انسان بننے کے لئے تیار کرنا' اشرف مقابلہ میں جس تصویر کو لاکھوں ڈالر کا اول انعام حاصل ہوا وہ ایک قحط زدہ علاقہ کا تھا۔ ایک بھوکا، فاقہ زدہ، بیمار، کمزور شخص اس فوڈ پیکٹ کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جو ہیلی کاپٹر سے گرایا گیا تھا۔ فوٹو گرافر کو جب انعام کی اطلاع ملی تو اس نے خودکشی کر لی۔ سوسائڈ نوٹ میں لکھا' کاش! کیمرہ کلک کرنے کی بجائے میں اس وقت فوڈ پیکٹ اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں تھما دیتا۔

آج انسان بھلے ہی پرندوں کی طرح آسمان میں پرواز کر لے، سمندر میں مچھلیوں کی طرح تیر لے، زمین پر آدمی کی طرح چل نہیں سکتا، انسانیت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تو وہ اشرف المخلوقات بھی نہیں کہلا سکتا۔ بچوں میں حس پذیری جگانا بچوں کے ادیب کا کام ہے

(7) بچوں سے رابطہ قائم رکھنا بچوں کے ادیب کے لئے بے حد ضروری ہے۔۔۔ اُن کے ساتھ بچہ بن جانا' ان کی آنکھوں سے دنیا دیکھنا' ان کے دماغ سے سوچنا اور ان کی خواہشات کو الفاظ کا جامہ پہنانا ادب اطفال کی تخلیق کرنا ہے۔ سوامی ودیکانند کہتے ہیں:

'A true writer is one,who immediately comes down to the level of children and see through and think through his mind.

ان تقاضوں کی تکمیل وقت کا تقاضہ ہے۔

☆☆☆

ایک فارسی حکایت

ابوسعید ابوالخیر سے کسی نے کہا:

''کیا کمال کا انسان ہوگا وہ جو ہوا میں اُڑ سکے۔

ابوسعید نے جواب دیا'' یہ کونسی بڑی بات ہے؟ یہ کام تو مکھی بھی کر سکتی ہے اور اگر کوئی شخص پانی پر چلے' اُس کے بارے میں کیا فرمانا ہے؟

'' یہ بھی کوئی خاص بات نہیں ہے کیونکہ لکڑی کا ٹکڑا بھی سطح آب پر تیر سکتا ہے''۔

اس شخص نے پوچھا تو پھر آپ کے خیال میں کمال کیا ہے؟

''میری نظر میں کمال یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان رہ اور کسی کو تمہاری زبان سے تکلیف نہ پہنچے' جھوٹ کبھی نہ کہو' کسی کا تمسخر مت اُڑاؤ' کسی کی ذات سے کوئی ناجائز فائدہ مت اُٹھاؤ۔ یہ کمال ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ کسی کی ناجائز بات یا عادت کو برداشت کیا جائے۔ یہ کافی ہے کہ کسی کے بارے میں بن جانے کوئی رائے قائم نہ کریں۔ یہ لازمی نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو خوش کرنے کی کوشش کریں۔ یہ کافی ہے کہ ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم دوسروں کی اصلاح کریں' یہ کافی ہے کہ ہماری نگاہ اپنے عیوب پر ہو۔ حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کریں' اتنا کافی ہے کہ ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوں۔ دوسروں کے ساتھ امن کے ساتھ جینا کمال ہے۔

(س۔م۔خان)

oOo

رحمٰن جامؔی
حیدرآباد

غزلیں

ہر انجمنِ نازٗ حسینوں سے ہے خالی
یہ شہرِ بُتاں اپنے مکینوں سے ہے خالی
تم کیا گئے ویرانی سی ویرانی ہے ہر سُو
آجاؤ کہ گھر میرا مہینوں سے ہے خالی
ہے چاروں طرف میرے اندھیرا ہی اندھیرا
جب سے یہ جگہ ماہ جبینوں سے ہے خالی
اس گھر میں بھی اب شکوئ شکایات نہیں ہیں
یہ گھر بھی محبت کے قرینوں سے ہے خالی
اِک دن اُسے ہم دیں گے محبت کا سہارا
مانا کہ محبت ابھی سینوں سے ہے خالی
اخلاق کے موتی نہ محبت کے ہیں ہیرے
اب اپنی زمیں سارے خزینوں سے ہے خالی
جامؔی وہاں بوئی ہیں ابھی پیار کی فصلیں
دیکھی جو جگہ بانجھ زمینوں سے ہے خالی

ooo

حالِ دل باوقار ہو نہ سکا
کوئی بھی راز دار ہو نہ سکا
درد بڑھتا گیا پتہ نہ چلا
غم مِرا آشکار ہو نہ سکا
اہلِ دولت نے تو بہت چاہا
ہم غریبوں سے پیار ہو نہ سکا
آخرش ٹوٹ ہی گیا رشتہ
دردِ دل استوار ہو نہ سکا
میں غمِ زندگی کی راہوں سے
لاکھ چاہا فرار ہو نہ سکا
ایک مدت سے دل کا ساتھ رہا
پھر بھی یہ اپنایار ہو نہ سکا
یار جامؔی کے ہیں کئی احباب
پر کوئی غم گُسار ہو نہ سکا

ooo

جمیلؔ نظام آبادی
نظام آباد

غزلیں

ظلم اور دھوکے کی تیری حکمرانی مسترد
جھوٹ پر مبنی یہ قصے یہ کہانی مسترد
جس کے منہ پر رام ہو جس کے بغل میں چھری
ایسا راجہ مسترد اور ایسی رانی مسترد
جانتے ہیں سب تری چالوں کو تیرے مکر پر
یہ دکھاوے کی تری ہر مہربانی مسترد
ہوگئی تاریخ بھی فرقہ پرستی کا شکار
اس نے کردی ہے ہماری ہر کہانی مسترد
ہم نہیں بھولے ترے ساحل ہوا تھا کیا فرات
ہم نے تو اب کردیا ہے تیرا پانی مسترد
لاکھ طاقت سے دباؤ حق کو دب سکتا نہیں
ہوگی حق کی جیت ہوگی بے ایمانی مسترد
جس کو رب کا خوف نہ ہو اور برے اعمال ہوں
ایسے ہر ہر نوجواں کی نوجوانی مسترد
میں نہیں جُھکتا کسی کے سامنے اے زندگی
زندگی گر ضد کرے تو زندگانی مسترد
تیرے ہر ہر سچ کو دنیا جھوٹ سمجھے گی جمیلؔ
اور کردے گی تری ہر لن ترانی مسترد

ooo

خیال و فکر کی شمع جلا کے
جیو دنیا میں اپنا سر اُٹھاکے
بڑھادیتے ہیں جو درجے وفا کے
وہ خوش رہتے ہیں اپنا غم چھپائے
زمانے کی قسم ہم جی رہے ہیں
زمانے کے کئی صدمے اُٹھا کے
مری آنکھوں میں ہے تصویر کس کی
کبھی تم دیکھ لو آنکھیں ملا کے
کوئی احسان ہم پر کرگیا ہے
سبق ہم کو محبت کا پڑھاکے
ترے ہر کام کو آساں کرے گا
ترا ملنا ہر اک سے مسکراکے
چلو آؤ کہ کچھ نیکی کمالیں
کسی کی راہ سے کانٹا ہٹاکے
جبیں سجدوں سے خالی ہورہی ہے
نمازیں پڑھتے ہیں کرسی بچھاکے
تمہاری یاد کو اب تک بھی جاناں
رکھا ہے ہم نے سینے سے لگاکے
جمیلؔ یہ کون پوچھے نسلِ نَو سے
تقاضے کیا ہوئے شرم و حیا کے

ooo

محمد محبوب خان افسرؔ عثمانی
کریم نگر

غزلیں

رسوائیوں کی موت نہ مرجائے آدمی
بہتر ہے اس سے پہلے سدھر جائے آدمی

کل کا بھروسہ کیا ہے وفا زندگی کرے
کرنا جو کل ہے آج ہی کرجائے آدمی

یہ راز آج تک نہ سمجھ پاسکا کوئی
آئے کہاں سے اور کدھر جائے آدمی

مشکل سہی ہزار ارادے ہوں گر بلند
تسخیر کائنات کی کرجائے آدمی

دیکھی ہوئی ہے عظمتِ دنیا جہاں نظر
ٹھکراکے سب جہاں سے گذر جائے آدمی

دن بھر کی محنتوں کا صلہ چور لے اُڑے
کس منہ سے کہیے لوٹ کے گھر جائے آدمی

پہلا سا وہ مقام نہ وہ مرتبہ ملے
دل سے جو ایک بار اُتر جائے آدمی

افسرؔ حدوں کو توڑ گذرتا ہے جو یہاں
برباد زندگانی وہ کرجائے آدمی

ooo

خیال و فکر کی رعنائیاں حیات میں رکھ
اُمید افزا نتائج توقعات میں رکھ

مقام بندہ و مولا میں رکھ تمیز ذرا
حقیقتوں کو موقر تفکرات میں رکھ

کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے زادِ سفر
متاعِ علم و ہنر کچھ تو اپنے ساتھ میں رکھ

جنوں نوازیاں منزل اِسی کی ضامن ہیں
نوازشاتِ زمانہ کو واردات میں رکھ

ہوائے نفس سے اپنے جہاد کرتا چل
حقیقتوں کو نہ جھٹلا تو کیفیات میں رکھ

یوں ہاتھ کاٹ کے دے دے نہ اپنے ورثا کو
تری کمائی کا حصہ کچھ اپنے ہاتھ میں رکھ

اُلٹ نہ دے کوئی افسرؔ بساط خاطر دل
تو اختیارِ تمیزی تصرّفات میں رکھ

ooo

مختارؔ ٹونکی
کالی پلٹن روڈ، پُل محمد خان
ٹونک۔001 304 راجستھان

غزلیں

گلاب لفظوں کا تحفہ سنبھال کر رکھنا
زبانِ اُرد وکا لہجہ سنبھال کر رکھنا
ورق ورق پہ تمہارا ہی نام لکھا ہے
کتابِ دل کا یہ نسخہ سنبھال کر رکھنا
میں لوٹ آؤں گا اگلی بہار آنے تک
یہ پھول پھول سا چہرہ سنبھال کر رکھنا
میں ڈھونڈھ کر کسی عیسیٰ نفس کو لاؤں گا
تم آرزوؤں کا لاشہ سنبھال کر رکھنا
میں خط میں پیار کا اظہار کس طرح کرتا
ہے لفظ لفظ پہ بوسہ سنبھال کر رکھنا
نہیں کتاب خزینہ ہے علم و حکمت کا
مرے رسولؐ کا تحفہ سنبھال کر رکھنا
ہمارے پُرکھوں کی پوشیدہ صورتیں ہونگی
گذشتہ دور کا شیشہ سنبھا ل کر رکھنا
دلوں کی خیر دلوں کو بھی لُٹتے دیکھا ہے
تم اپنے دل کی یہ ڈبیہ سنبھال کر رکھنا
ابھی حیات کو مختارؔ اور نکھرنا ہے
رُخِ حیات کا غازہ سنبھال کر رکھنا

oOo

وہ جب گود ماں کی مرے پاس تھی
ہنسی بھی خوشی بھی مرے پاس تھی
لٹیروں نے لوٹا اسے بھی نہ چھوڑا
شرافت کی پونجی مرے پاس تھی
نہ سیکھا اُڑانا ضرورت نہ سمجھی
پتنگ، ڈور، چرخی مرے پاس تھی
بہت جھوٹ بولا ہے زندگی میں
صداقت بھلے ہی مرے پاس تھی
زمین و فلک بھی نگوں بن کے رہتے
وہ قاتل ادا بھی مرے پاس تھی
جفا جو کو میں یہ بتاتا بھی کیسے
''وفا'' ایک لفظی مرے پاس تھی
کہیں کام کرنے کا موقع نہ پایا
یوں محنت بلا کی مرے پاس تھی
بھلا کیسے رہتی مری جان تن میں
نہ تالا نہ کنجی مرے پاس تھی
سنبھالا لیا تو یہ مختار دیکھا
فقط ایک بیٹی مرے پاس تھی

oOo